اکتوبر ۱۹۹۸ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

اندرونِ عرب تکمیلِ انقلاب کی تمہید

صُلح حُدیبیہ

ڈاکٹر اسرار احمد

رفقاء واحباب تنظیم اسلامی و معاونین تحریک خلافت پاکستان کے لئے اطلاع

تنظیم اسلامی پاکستان کا سالانہ اجتماع

ان شاء اللہ جمعۃ المبارک 6 نومبر تا اتوار 8 نومبر 98ء

گلشن اقبال کراچی میں 'نزد جامع مسجد بیت المکرم مین یونیورسٹی روڈ منعقد ہو گا

☆ اجتماع کا آغاز' امیر تنظیم اسلامی و داعی تحریک خلافت پاکستان ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ' کے خطاب جمعہ سے ہو گا جو دوپہر 12 بجے شروع ہو گا۔ شرکاء اجتماع سے گزارش ہے کہ وہ ساڑھے گیارہ بجے تک اجتماع گاہ میں پہنچ جائیں۔

☆ براہ کرام اپنی آمد سے استقبالیہ کو مطلع کیجئے اور تعارفی کارڈ حاصل کر کے اپنے سینے پر آویزاں کیجئے۔

☆ استقبالیہ کی طرف سے آپ کے لئے جو رہائش گاہ متعین کی جائے وہیں پر قیام اختیار کیجئے۔ اگر کسی وجہ سے رہائش گاہ کی تبدیلی ناگزیر ہو تو اس کے لئے ناظم رہائش گاہ سے رجوع کیجئے۔

☆ اجتماع میں ہمہ وقت شرکت لازمی ہے۔ اگر کسی وقت اشد ضرورت کے تحت آپ کو اجتماع سے غیر حاضر ہونا پڑے تو اپنے امیر سے اس کی اجازت حاصل کیجئے اور استقبالیہ پر اپنے جانے اور واپس آنے کی اطلاع دیجئے۔

☆ شرکاء کی رہنمائی اور سہولت کے لئے 5 نومبر دوپہر 12 بجے سے 6 نومبر دوپہر ایک بجے تک کراچی کینٹ اسٹیشن پر استقبالیہ کیمپ قائم ہو گا۔

☆ اجتماع کے دوران کراچی میں سردیوں کی آمد آمد ہو گی لہٰذا شرکاء اپنے ہمراہ بستر کے ساتھ کمبل ضرور لائیں۔

☆ طعام کے لئے زر تعاون =/150 روپے فی کس ہو گا۔

المعلن : محمد نسیم الدین' امیر تنظیم اسلامی حلقہ سندھ و بلوچستان
و ناظم سالانہ اجتماع

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد کرو جو اُس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

جلد : ۴۷
شمارہ : ۱۰
جمادی الاخریٰ ۱۴۱۹ھ
اکتوبر ۱۹۹۸ء
فی شمارہ ۱۰/-
سالانہ زر تعاون ۱۰۰/-

سالانہ زر تعاون برائے بیرونی ممالک

- امریکہ' کینیڈا' آسٹریلیا' نیوزی لینڈ — 22 ڈالر (800 روپے)
- سعودی عرب' کویت' بحرین' قطر عرب امارات' بھارت' بنگلہ دیش' افریقہ' ایشیا یورپ' جاپان — 17 ڈالر (600 روپے)
- ایران' ترکی' اومان' مسقط' عراق الجزائر' مصر' — 10 ڈالر (400 روپے)

ترسیل زر : مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

ادارۂ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید
حافظ خالد محمود خضر

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقام اشاعت : 36۔کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور54700۔فون : 03-02-5869501
مرکزی دفتر تنظیم اسلامی : 67۔گڑھی شاہو' علامہ اقبال روڈ' لاہور' فون : 6305110
پبلشر: ناظم مکتبہ' مرکزی انجمن' طابع : رشید احمد چودھری' مطبع : مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

☆ **عرض احوال** _____ ۳

حافظ عاکف سعید

☆ **منہج انقلاب نبوی ﷺ** [۹] _____ ۵

اندرون عرب تکمیل انقلاب کی تمہید : صلح حدیبیہ

ڈاکٹر اسرار احمد

☆ **فکر عجم** [۱۲] _____ ۳۳

ایران میں پارلیمانی انقلاب [۲]

ڈاکٹر ابو معاذ

☆ **نکسن کا نوحہ** _____ ۴۵

امریکی معاشرے کی سیاسی اور اخلاقی حالت زار کے حوالے سے

چوہدری مظفر حسین

☆ **داستان عزیمت** _____ ۷۰

حضرت امام شامل ؒ کا تابناک کردار

اظہار احمد قریشی

☆ **حالات حاضرہ** _____ ۷۷

امیر تنظیم اسلامی کے خطابات جمعہ کے پریس ریلیز

سانحۂ ارتحال

ماہنامہ "میثاق" کے معزز رکن ادارۂ تحریر اور ہمارے قابل احترام بزرگ، شیخ جمیل الرحمٰن کے صاحبزادے میاں خالد جمیل کا گزشتہ ماہ قضائے الٰہی سے انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم کچھ عرصہ سے عارضۂ قلب میں مبتلا تھے۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کی خطاؤں سے درگزر فرماتے ہوئے انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل سے نوازے، بالخصوص محترم شیخ جمیل الرحمٰن کو صبر و ہمت کے ساتھ اس صدمے کو جھیلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔ (ادارہ)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرض احوال

ماہ گزشتہ کے دوران دو واقعات پے بہ پے ایسے ہوئے کہ جنہوں نے وقتی طور پر ملک و قوم کو درپیش دیگر تمام مسائل و معاملات کو پس منظر میں دھکیل دیا۔ پہلا واقعہ جو ہمارے نزدیک بہت سے اعتبارات سے نہایت خوش آئند ہے پندرھویں ترمیم پر مشتمل شریعت بل کے مسودہ کا قومی اسمبلی میں پیش کیا جانا ہے کہ جس کی راہ تکتے تکتے ہماری نگاہیں تھک ہار کر پتھرانے کو تھیں۔ شریعت بل کے منظرعام پر آتے ہی ملکی سیاسی فضا یکدم بدل گئی۔ قبل ازیں ملک کے قریباً تمام دینی و سیاسی عناصر کی جانب سے موجودہ حکومت کے خلاف کسی نہ کسی حوالے سے احتجاجی اور اختلافی آوازیں اٹھ رہی تھیں' شریعت بل کے اعلان کے ساتھ ہی تمام دینی طبقات کی جانب سے تائید و حمایت کی آوازیں نہایت بلند آہنگ کے ساتھ سنائی دینے لگیں۔ بعض دینی سیاسی جماعتوں نے اس بل کے ساتھ جزوی اختلاف ظاہر کرتے ہوئے اس کی مشروط حمایت کا اعلان کیا لیکن اکثر و بیشتر جماعتوں اور رجال دین نے اس کی پرزور تائید کی اور نہ صرف یہ کہ میاں نواز شریف کو بھرپور تعاون کا یقین دلایا بلکہ مجوزہ پندرھویں ترمیم کے مخالفین کیلئے سخت ترین الفاظ کے استعمال سے بھی گریز نہیں کیا۔ اپوزیشن پارٹیز نے البتہ مجوزہ آئینی ترمیم کی شدید مخالفت کی اور یہ موقف اختیار کیا کہ اس ترمیم کے ذریعے میاں نواز شریف درحقیقت نفاذِ شریعت کی آڑ میں اپنے لئے غیر معمولی اختیارات حاصل کرنا چاہتے ہیں ـــــ بہرکیف شریعت بل کے حوالے سے قومی اخبارات میں اس کی حمایت اور مخالفت میں بیانات کی وہ ہاہا کار مچی کہ دیگر تمام ملکی و بین الاقوامی مسائل دب کر رہ گئے۔ بیان بازی کی گرماگرمی ابھی جاری تھی کہ اچانک سی ٹی بی ٹی پر دستخط کرنے کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ مسئلہ بھی کچھ اس شان سے اٹھا کہ نہ صرف یہ کہ شریعت بل کے حوالے سے بیانات کی گرد اچانک بیٹھ گئی بلکہ یوں محسوس ہونے لگا کہ تمام ملکی و قومی مسائل بھی اسی ایک مسئلہ پر موقوف ہو کر رہ گئے ہیں۔

تازہ ترین صورتحال یہ ہے کہ سی ٹی بی ٹی پر دستخط کے معاملہ کو سردست التوا میں ڈال دیا گیا ہے (سی ٹی بی ٹی کے ضمن میں تنظیم اسلامی اور اس کے امیر کا موقف پریس ریلیز کی شکل میں زیر نظر شمارہ میں شامل کر دیا گیا ہے)۔ اگرچہ شریعت بل کے ضمن میں حکومتی حلقوں کی جانب سے جس جوش و خروش کا مظاہرہ شروع ہوا تھا وہ اب بہت حد تک سرد مہری میں بدل چکا ہے اور مخالفین کا یہ الزام بھی ایک حد تک درست معلوم ہوتا ہے کہ شریعت بل کا شوشہ دراصل سی ٹی بی ٹی پر دستخط کے لئے راہ ہموار کرنے کی خاطر کھڑا کیا گیا تھا' تاہم اب توقع ہے کہ شریعت بل کا معاملہ ایک بار پھر

گرم ہو گا' لہٰذا مناسب ہو گا کہ اس مجوزہ پندرھویں آئینی ترمیم کے بارے میں امیر تنظیم اسلامی کے موقف کو وضاحت کے ساتھ قارئین کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ امیر تنظیم نے ۳۱/ اگست کو لاہور پریس کلب میں پریس کانفرنس کے موقع پر اس بارے میں حسب ذیل بیان جاری فرمایا تھا :

—— دستور پاکستان میں مجوزہ پندرھویں ترمیم میں قرآن اور سنت کو پاکستان کا سپریم لاء قرار دینا نہایت خوش آئند اور لائق صد مبارکباد ہے!

—— لیکن اس کی تنفیذ کے لئے ازمنہ وسطیٰ کے سلاطین کا سا انداز اختیار کرنا ہرگز درست نہیں!

—— بلکہ اس کا سیدھا راستہ یہ ہے کہ :

۱) مجوزہ دفعہ ۲۔ ب میں موجودہ دستور کی دفعہ ۲۲۷ کے الفاظ بھی شامل کر دیئے جائیں' اور اس کے بعد اسلامی نظریاتی کونسل کو خواہ ختم کر دیا جائے خواہ اسے حکومت کے مشاورتی ادارے کی حیثیت سے باقی رکھا جائے۔

۲) وفاقی شرعی عدالت کے دائرہ کار پر عائد جملہ تحدیدات ختم کر دی جائیں۔

۳) وفاقی شرعی عدالت اور سپریم کورٹ کے شرعی اپیلیٹ بنچ کے جج صاحبان کی حیثیت جملہ اعتبارات سے ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے جج صاحبان کے مساوی بنائی جائے

—— اور ان دونوں عدالتوں میں عالم ججوں کی تعداد بڑھائی جائے۔

—— معاشرے میں "معروف" کے فروغ اور "منکر" کے استیصال کیلئے پوری قانون سازی دستور میں طے شدہ طریقہ کار یعنی نیشنل اسمبلی اور سینٹ کی سادہ اکثریت کی رائے سے کی جائے۔ اور دستور میں ترمیم کیلئے موجودہ طریق کار برقرار رہنا چاہیئے!

—— اسلام دین فطرت ہے اور اس کی تعلیمات میں کوئی بھی چیز ایسی نامعقول نہیں ہے جو دستور میں طے شدہ قانون سازی کی چھلنیوں میں سے نہ گزر سکے!

—— ہمارا مقصد (علامہ اقبال اور قائداعظم کے فرمودات کے مطابق) پاکستان کو عہد حاضر کے تقاضوں کے مطابق جدید اسلامی فلاحی ریاست بنانا ہے۔ اور جدید ریاست کی مشین (STATE-CRAFT) میں مقننہ' انتظامیہ اور عدلیہ کے مابین ربط و تعلق اور توازن و تحدید کا معاملہ نہایت اہم بھی ہے' اور حد درجہ لطیف اور نازک بھی۔ اس میں کوئی بگاڑ پیدا کر دینا خواہ وہ کتنی ہی اچھی نیت سے کیوں نہ ہو' پورے نظام کو درہم برہم کر سکتا ہے۔

—— میاں نواز شریف نے دستور میں پندرھویں (مجوزہ) ترمیم کو ایک ایسے پیکج کی شکل دے کر جس میں کتاب و سنت کو سپریم لاء قرار دینے کے ساتھ ایک ناگزیر جزو کے طور پر دستور کی دفعہ ۲۳۹ میں ترامیم کو بھی شامل کر دیا گیا ہے' تقریباً وہی صورت پیدا کر دی ہے جو مرحوم ضیاء الحق صاحب

(باقی صفحہ ۸۰ پر)

سلسلۂ تقاریر ——— منہج انقلابِ نبویؐ ——— خطاب ہفتم

اندرونِ عرب تکمیلِ انقلاب کی تمہید

فراستِ نبویؐ کا شاہکار اور فتحِ مبین

یعنی

صلح حدیبیہ

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد

(مرتب : شیخ جمیل الرحمٰن)

حضورؐ کا خواب

غزوۂ احزاب کے اگلے ہی سال ۶ھ میں رسول اللہ ﷺ نے خواب دیکھا کہ آپؐ اور آپؐ کے ساتھی اہل ایمانؓ عمرہ ادا کر رہے ہیں۔ چونکہ نبی کا خواب بھی وحی ہوتا ہے لہٰذا نبی اکرم ﷺ نے اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک غیبی اشارہ اور حکم سمجھ کر اعلان عام کرا دیا کہ ہم عمرہ کے لئے جائیں گے' جو ہمارے ساتھ جانا چاہیں وہ چلیں۔ جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اُس وقت حضور ﷺ کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو گئے تھے' وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ وہ گویا موت کے منہ میں جا رہے ہیں۔ اس لئے کہ وہ اگرچہ عمرہ کی نیت سے جا رہے تھے' لیکن قریش کے نزدیک تو یہ ایک نوع کی چڑھائی تھی۔ وہ عمرہ کے لئے اہل ایمان کو مکّہ میں داخل ہونے دیں تو گویا یہ ان کے لئے اپنی رہی سہی ساکھ اور بچا کھچا وقار بھی ہمیشہ کے لئے خود اپنے ہاتھوں خاک میں ملانے کے مترادف تھا۔ یہ تو ان کے لئے ایک نوع کی شکست تھی کہ وہ مسلمانوں کو عمرہ ادا کرنے دیتے۔ اس کے بعد تو عرب میں ان کی

کوئی حیثیت باقی نہ رہتی۔ حضور ﷺ کے ساتھ چلنے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعداد کے بارے میں مختلف روایات میں چودہ سو سے لے کر دو ہزار تک کی تعداد کا ذکر ملتا ہے۔ تاہم زیادہ تر روایات کے مطابق تعداد چودہ سو تھی۔ ذوالحلیفہ کا مقام مدینہ سے تقریباً سات آٹھ میل باہر ہے۔ یہاں سے عمرہ یا حج کے لئے احرام باندھنے کی حد شروع ہو جاتی ہے۔ وہاں حضورؐ اور آپؐ کے تمام ساتھیوں رضی اللہ عنہم نے عمرہ کا احرام باندھا اور ہدی (قربانی) کے جو جانور ساتھ تھے ان کے گلوں میں پٹے ڈال دیئے گئے' جو اِس بات کی علامت تھی کہ یہ جانور قربانی کے ہیں۔ ان کاموں سے فارغ ہو کر آپؐ نے مکّہ کی طرف سفر جاری رکھا' حتیٰ کہ حدیبیہ کے مقام پر جا کر پڑاؤ کیا۔ اسی مقام پر نبی اکرم ﷺ اور مشرکین قریش کے مابین وہ صلح ہوئی جو تاریخ میں "صلح حدیبیہ" کے نام سے موسوم ہے اور جسے قرآن حکیم نے سورۃ الفتح میں "فتح مبین" قرار دیا ہے : ﴿ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۝ ﴾

اہل مکّہ کا ردِّ عمل

نبی اکرم ﷺ نے اِدھر حدیبیہ کے مقام پر پڑاؤ فرمایا' اُدھر جب قریش کے علم میں آ گیا کہ حضورؐ عمرہ کے ارادہ سے تشریف لائے ہیں تو انہوں نے اعلان کر دیا کہ ہم محمدؐ (ﷺ) اور ان کے ساتھیوں (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کو کسی صورت بھی مکّہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ بلکہ انہوں نے اپنے تمام حلیفوں کو پیغام بھیج دیا کہ وہ سب آ کر قریش کی مدد کریں تاکہ سب مجتمع ہو کر اپنی پوری قوت کے ساتھ محمدؐ (ﷺ) کا راستہ روک سکیں۔ نبی اکرم ﷺ کو بھی یہ خبریں پہنچ رہی تھیں۔ بدیل بن ورقہ خزاعی قبیلہ بنو خزاعہ سے تعلق رکھتے تھے' جو مکّہ اور مدینہ کے مابین آباد تھا۔ اس قبیلہ کا کچھ دوستانہ تعلق قریش کے علاوہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ بھی تھا۔ چنانچہ حضور ﷺ نے بدیل بن ورقہ کو اس کام کے لئے مامور کیا کہ وہ مکّہ والوں کی خبر لا کر دیں کہ صورت حال کیا ہے! انہوں نے آ کر خبر دی کہ قریش نے ایک بہت بڑا لشکر جمع کر لیا ہے اور ان کا عزمِ مصمم ہے کہ وہ کسی صورت میں بھی آپؐ کو مکّہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ حضور ﷺ نے ان سے

فرمایا کہ تم مکہ جا کر ہماری طرف سے قریش سے کہو کہ ہمارا جنگ کا کوئی ارادہ نہیں ہے' ہماری کسی سے لڑنے بھڑنے کی کوئی نیت نہیں ہے' ہم محض عمرہ کے لئے آنا چاہتے ہیں' اور قریش کو سمجھاؤ کہ انہیں پہلے بھی ان جنگوں کے سلسلہ نے بہت نقصان پہنچایا ہے' اب بہتر یہی ہے کہ ہمارے اور ان کے مابین کچھ عرصہ کے لئے صلح ہو جائے اور قریش ہمیں عرب کے دوسرے قبائل سے نمٹنے کے لئے آزاد چھوڑ دیں تاکہ ہم بقیہ عرب کے ساتھ اپنے معاملات طے کرلیں۔ اسی میں خیر ہے' اسی میں ہماری اور ان کی بہتری ہے۔ چنانچہ وہ ہمیں پُرامن طور پر عمرہ ادا کرنے دیں اور مزاحمت کا ارادہ ترک کر دیں۔

بدیل بن ورقہ حضورؐ کے اس پیغام کے ساتھ مکہ پہنچے۔ وہاں ایک بڑی چوپال میں جا کر' جہاں قریش کے بڑے بڑے گھرانوں کے سردار جمع تھے' انہوں نے کہا کہ میں محمد (ﷺ) کی طرف سے ایک پیغام لایا ہوں' اگر آپ حضرات اجازت دیں تو عرض کروں! ____ انہوں نے یہ انداز شاید اس لئے اختیار کیا ہو گا کہ پہلے یہ اندازہ ہو جائے کہ قریش مکہ کا رجحان (mood) کیا ہے! چنانچہ ان میں Hawks (یعنی مشتعل مزاج اور جنگجو لوگوں) نے تو فوراً کہا کہ ہم نہ تو کوئی بات سننے کے لئے تیار ہیں اور نہ ہمیں اس کی کوئی ضرورت اور حاجت ہے۔ مگر Doves (یعنی صلح پسند افراد) نے کہا کہ نہیں! ہمیں بات سننی چاہئے اور بدیل سے کہا سناؤ کہ محمدؐ (ﷺ) کہتے کیا ہیں! انہوں نے حضور ﷺ کا پیغام من و عن سنا دیا۔

عروہ بن مسعود ثقفی کا مدبرانہ رویہ

اُس وقت طائف کے مشہور قبیلہ بنو ثقیف کے سردار عروہ بن مسعود ثقفی بھی وہاں موجود تھے۔ مکہ اور طائف کو جڑواں شہروں (Twin Cities) کی حیثیت حاصل تھی۔ ان کے مابین رشتہ داریاں بھی بہت تھیں اور مکہ کے اکثر رؤسا کی جائیدادیں اور باغات بھی طائف میں کثرت سے تھے۔ اس موقع پر ان ثقفی سردار عروہ بن مسعود[1] نے کھڑے ہو کر کہا "اے قریش! کیا میں تمہارے لئے باپ کی مانند نہیں ہوں اور کیا تم

(۱) عروہ بعد میں ایمان لے آئے تھے اور انہیں صحابی ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ (رضی اللہ عنہ)

میرے بچوں کی مانند نہیں ہو؟" مجلس کے شرکاء نے کہا "ایسا ہی ہے"۔ پھر انہوں نے کہا "کیا تمہیں مجھ پر اعتماد ہے کہ میں جو کچھ کہوں گا تمہاری بہتری کے لئے کہوں گا؟" لوگوں نے جواب میں کہا کہ "ہاں ہمیں اس پر بھی اعتماد ہے" ـــــ تو انہوں نے کہا "مجھے اجازت دو کہ میں محمد (ﷺ) کے پاس جاؤں اور ان سے بات چیت کروں"۔ لوگوں نے اس تجویز کو قبول کر لیا۔

عروہ بن مسعود کی نبی اکرم ﷺ سے گفت و شنید

حدیبیہ میں جہاں نبی اکرم ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کا پڑاؤ تھا' عروہ وہاں آئے۔ وہ بہت ہی زیرک' دانا اور مدبر انسان تھے' آخر ثقیف کے سردار تھے' جو قریش کے بعد سب سے معزز قبیلہ شمار ہوتا تھا۔ انہوں نے وہاں پہنچ کر لشکر کے ماحول اور نظم و ضبط کا ایک اندازہ قائم کرنے کے لئے بھرپور جائزہ لیا۔ پھر وہ نبی اکرم ﷺ کے خیمہ میں حاضر ہوئے اور سب سے پہلے تو انہوں نے خوفزدہ کرنے کا انداز اختیار کرتے ہوئے کہا :

> "محمد! (ﷺ) ایک طرف قریش اور ان کے حلیف ہیں' ان کی پوری قوت مجتمع ہے ـــــ اور ان کا فیصلہ ہے کہ وہ کسی صورت میں بھی تم کو اور تمہارے ساتھیوں کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے' وہ اس پر تلے ہوئے ہیں۔ اب تم دیکھ لو کہ اگر جنگ ہوئی اور بالفرض تم نے مکہ والوں کو ختم کر دیا تو کیا یہ کوئی اچھی بات ہو گی؟ اس سے پہلے کیا کسی شریف انسان کی ایسی مثال موجود ہے کہ اس نے اس طرح اپنے ہی قبیلہ کو ختم کر دیا ہو؟ اور اگر معاملہ برعکس ہوا تو میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے ساتھ جو جمعیت ہے وہ تو مختلف قبائل سے آئے ہوئے لوگوں پر مشتمل ہے (گویا کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا والا معاملہ ہے)۔ شکست اور ہزیمت کی صورت میں یہ سب تمہیں چھوڑ کر بھاگ جائیں گے' ان میں سے کوئی بھی تمہارے ساتھ کھڑا نہیں رہے گا۔"

عروہ بن مسعود کے پیش نظر چونکہ قبائلی نظام تھا اور وہ جانتے تھے کہ قبائل تو عموماً قبائلی حمیت کے تحت لڑتے تھے' چنانچہ انہوں نے یہ بات اپنے تجربہ کی بنیاد پر کہی تھی۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس موقع پر نبی اکرم ﷺ کے ساتھ تھے۔ ان کو عروہ بن

مسعود کی اس بات پر طیش آگیا۔ انؓ کی زبان سے عروہ کے لئے ایک عریاں گالی نکل گئی اور انہوںؓ نے کہا "کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم رسول اللہ ﷺ کو چھوڑ دیں گے۔ خدا کی قسم ہم ان کو چھوڑنے والے نہیں ہیں"۔ گالی سن کر عروہ نے پوچھا' یہ کون ہیں۔ بتایا گیا کہ یہ ابوبکرؓ ہیں تو عروہ نے کہا "ان کا مجھ پر ایک احسان ہے۔ ورنہ آج میں انہیں اس گالی کا جواب دیتا۔"

اس کے بعد عروہ نے نبی اکرم ﷺ سے گفتگو کرتے ہوئے یہ گستاخانہ انداز اختیار کیا کہ بار بار حضورؐ کی ریش مبارک کی طرف ہاتھ بڑھاتے۔ وہ شاید یہ دیکھنا چاہتے ہوں کہ حضورؐ کے بارے میں آپؐ کے ساتھیوں کا طرز عمل کیا ہے! ـــــ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ بحیثیت محافظ وہاں کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے عروہ کی بار بار کی یہ حرکت دیکھ کر اپنی تلوار کا دستہ ان کے ہاتھ پر مارا اور کہا کہ آئندہ یہ ہاتھ حضورؐ کی ریش مبارک تک بڑھا تو قطع ہو جائے گا' واپس نہیں جا سکے گا ـــــ بہرحال عروہ یہ گفتگو کر کے اور ایک اندازہ قائم کر کے واپس مکہ چلے گئے۔

عروہ کا قریش کے سامنے اپنے تأثرات کا اظہار

مکہ پہنچ کر عروہ بن مسعود نے قریش کے سرداروں کے سامنے جو رپورٹ پیش کی اس سے ان کے اس تاثر کا اندازہ ہوتا ہے جو اہل ایمان کے لشکر کے نظم و ضبط' ان کے جوش و خروش اور ان کی فدائیانہ کیفیات کو دیکھ کر ان کے دل و دماغ پر مترتب ہوا تھا۔ انہوں نے کہا:

> "اے قریش کے لوگو! دیکھو' میں قیصر و کسریٰ کے ایوانوں میں گیا ہوں' میں نے ان کے دربار دیکھے ہیں' ان کا ٹھاٹھ باٹھ دیکھا ہے' لیکن خدا کی قسم میں نے کسی بادشاہ کو اس کی اپنی قوم میں ایسا محترم نہیں دیکھا جیسا کہ محمدؐ (ﷺ) کو اپنے اصحاب میں دیکھا ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ جو لوگ محمدؐ (ﷺ) کے ساتھ ہیں ان کو جتنی محبت محمدؐ (ﷺ) سے ہے اور جتنی عقیدت و توقیر اور عزت محمدؐ (ﷺ) کی ان کے دلوں میں ہے' اور اپنے دین کی جو حمیت اور فدائیانہ جذبہ ان کے دلوں میں ہے' وہ مجھے پوری زندگی میں کہیں بھی دیکھنے میں نہیں

آیا۔ میں نے تو یہاں تک دیکھا ہے کہ جب محمدؐ (ﷺ) وضو کرتے ہیں تو لوگ انؐ کے وضو کا پانی تبرک کے طور پر لینے کے لئے ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اگر وہ تھوکتے ہیں یا ان کے دہن سے بلغم نکلتا ہے تو لوگ اسے جھپٹ لیتے ہیں اور اس کو اپنے ہاتھوں اور چہروں پر مل لیتے ہیں۔ یہ محبت میں نے کسی قوم میں اپنے سردار اور قائد حتیٰ کہ کسی بادشاہ تک کے لئے نہیں دیکھی۔ لہٰذا بہتری اسی میں ہے کہ تم ان سے مت بھڑو' ان سے جنگ کا ارادہ ترک کردو اور مصالحت کرلو۔ "

قریش کے جوشیلے افراد کا ردعمل

عروہ کے اس اظہارِ خیال پر وہاں بڑا شور و غوغا ہوا کہ ہم مصالحت کے لئے ہرگز تیار نہیں ہیں۔ ہم محمدؐ (ﷺ) کو کسی صورت بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ مکّہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ محمدؐ (ﷺ) کو واپس جانا پڑے گا ورنہ خون کی ندیاں بہہ جائیں گی۔ انہوں نے یہی پیغام اپنے دو دوسرے اشخاص کے ذریعے حضور ﷺ کے پاس بھیجا' لیکن کوئی بات بنتی نظر نہیں آئی۔ فریقین میں سے کوئی بھی اپنے موقف سے ہٹنے کے لئے تیار نہیں ہوا اور تناؤ (Tension) کی کیفیت برقرار رہی۔

مصالحت کے لئے نبی اکرم ﷺ کی طرف سے مساعی

نبی اکرم ﷺ نے حدیبیہ کے مقام پر مقیم ہونے کے بعد بدیل بن ورقہ خزاعی کے ذریعے پہلا پیغام بھیجا تھا' جس کے نتیجہ میں پہلے عروہ بن مسعود حضورؐ کی خدمت میں گفتگو کے لئے آئے تھے اور اس کے بعد قریش کے چند مشتعل مزاج (Hawks) لوگ آپؐ کے پاس آئے' لیکن ان کا رویہ مصالحانہ نہیں تھا' بلکہ جارحانہ اور رعب ڈالنے والا تھا۔ اس پر نبی اکرم ﷺ نے خود سلسلہ جنبانی شروع کرنے اور اپنے اصحاب رضی اللہ عنہم میں سے کسی کو مکّہ والوں کے پاس افہام و تفہیم کے لئے بھیجنے کا ارادہ فرمایا۔ سب سے پہلے آپ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ میرا خیال ہے آپ مکّہ جائیں اور قریش سے مصالحت کی کوشش کریں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ حضورؐ اب مکّہ میں میرا کوئی ایسا رشتہ دار نہیں ہے جس کی امان و حمایت میں' میں مکّہ میں داخل ہو سکوں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ مجھے

دیکھتے ہی بغیر بات چیت کے قتل کر دیں۔ لہٰذا میں تجویز کرتا ہوں کہ میری بجائے عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو بھیجئے۔ ان کا قبیلہ بنو امیہ بہت مضبوط ہے۔ ان کے بہت سے قریبی رشتہ دار بھی وہاں موجود ہیں جن میں سے کسی کی بھی امان و حمایت میں وہ مکّہ میں داخل ہو سکتے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے اس رائے کو پسند فرمایا اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو مکّہ جانے کا حکم فرمایا۔ چنانچہ وہ تعمیل حکم میں مکّہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

حضرت عثمانؓ کا مکّہ پہنچنا' اور آپؓ کی شہادت کی افواہ کا پھیلنا

نبی اکرم ﷺ کی جانب سے اس سفارت کے لئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا انتخاب آں جنابؓ کی بے شمار فضیلتوں میں سے ایک فضیلت ہے۔ بہرحال حضرت عثمانؓ ابھی مکّہ میں داخل نہیں ہوئے تھے کہ باہر ہی ان کو اپنے چچازاد بھائی ابان بن سعید بن عاص مل گئے۔ انہوں نے آنجنابؓ کو اپنی پناہ اور حمایت میں لے لیا اور اس طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ قریش کے پاس پہنچ گئے۔ گفت و شنید کا سلسلہ دو تین روز تک چلتا رہا اگرچہ اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ قریش کسی صورت مصالحت پر آمادہ نہیں ہوئے۔ تاہم انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اب جب تم مکّہ میں آ ہی گئے ہو تو ہم تمہیں اجازت دیتے ہیں کہ تم کعبہ کا طواف کر لو' لیکن آپؓ نے نبی اکرم ﷺ کی معیت کی بغیر طواف کی یہ پیشکش قبول نہیں فرمائی۔ (۱)

گفت و شنید میں جو دیر لگی۔ تو اس طرح گویا وہ کیفیت پیدا ہو گئی جسے آج کل کی سیاسی اصطلاح میں "نظربندی" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ دریں حالات یہ خبر اڑ گئی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا گیا ہے۔

---

(۱) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مکّہ جانے کے بعد بعض اصحاب رسولؐ نے کہا کہ "عثمان رضی اللہ عنہ کو خانہ کعبہ کا طواف مبارک ہو"۔ حضور ﷺ تک جب یہ قول پہنچا تو آپؐ نے فرمایا "مجھے یقین ہے کہ اگر عثمان رضی اللہ عنہ عرصۂ دراز تک بھی مکّہ میں رہ جائیں تب بھی وہ اس وقت تک طواف نہیں کریں گے جب تک میں طواف نہ کر لوں"۔ (مرتب)

بیعت رضوان

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر جب نبی اکرم ﷺ کو پہنچی تو آپؐ نے اپنے ساتھیوں سے وہ بیعت لی جو کتبِ سیَر میں "بیعت رضوان" کے نام سے مشہور و معروف ہے اور جس کا ذکر سورۃ الفتح کی آیت ۱۸ میں ہے :

﴿ لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَ اَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ۝ ﴾

"(اے نبیؐ) بے شک اللہ مومنوں سے راضی ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے آپ سے بیعت کر رہے تھے اور اسے ان کے دلوں کا حال معلوم تھا۔ لہٰذا اس نے ان پر قلبی اطمینان و سکون نازل فرمایا اور انعام میں ان کو فتحِ قریب بخشی۔"

بیعت علی الموت

حدیبیہ کے مقام پر کوئی چھوٹا سا درخت تھا جس کے سایہ میں نبی اکرم ﷺ تشریف فرما ہو گئے اور وہاں آپؐ نے فرمایا کہ اب ہر مسلمان مجھ سے بیعت کر کے ایک عہد کرے ـــــ اس بیعت کے بارے میں دو روایات ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ بیعت علی الموت تھی۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ "ہر مسلمان میرے ہاتھ پر موت کی بیعت کرے کہ چاہے ہم سب ہلاک ہو جائیں لیکن عثمانؓ کے خون کا بدلہ لئے بغیر ہرگز یہاں سے نہیں ہٹیں گے۔ دوسری روایت ہے کہ اس بات پر بیعت لی گئی کہ : "اَنْ لَا نَفِرَّ" یعنی ہم یہاں سے پیٹھ نہیں موڑیں گے اور راہ فرار اختیار نہیں کریں گے۔ بہرحال اس بیعت کا مقصد یہ سامنے آتا ہے کہ کسی حالت میں پیٹھ نہیں دکھانی اور میدان جنگ سے جان بچا کر نہیں جانا۔ اگرچہ جان بچانے کی چند صورتیں وہ ہیں جن کی سورۃ الانفال میں اجازت دی گئی ہے اور انہیں جائز ٹھہرایا گیا ہے۔ مثلاً یہ کہ پینترا بدلنا مقصود ہو یا کسی جنگی حکمت عملی (Strategy) کا تقاضا ہو کہ پیچھے ہٹ جایا جائے۔ مگر یہاں اس امر کا فیصلہ ہو گیا کہ کسی صورت میں بھی یہاں سے نہیں ہٹنا۔ اب یہاں سے کسی جنگی حکمت کے تحت پسپائی (Strategic Retreat) کا امکان بھی باقی نہیں رہا۔ رہا جان بچا کر فرار ہونے کا

معاملہ تو یہ عمل گناہ کبیرہ میں شامل ہے ہی۔ گویا یہ بیعت علی الموت تھی کہ ہر شخص میدان میں ڈٹا رہے گا' صرف موت ہی اسے اس جنگ سے رستگاری دے سکے گی۔

حضرت عثمانؓ کی خصوصی فضیلت

ترجمان وحی جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بے شمار فضائل و مناقب مروی ہیں۔ ان کے علاوہ سیرت عثمانؓ کے متعدد واقعات آنجنابؓ کی فضیلتوں پر دلالت کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک خصوصی فضیلت یہ ہے کہ دو مواقع پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی عدم موجودگی کے باوجود حضور ﷺ نے گویا انؓ کو موجود قرار دیا۔ پہلا موقع غزوۂ بدر کا ہے۔ آنجنابؓ کی اہلیہ اور نبی اکرم ﷺ کی لختِ جگر حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کافی علیل تھیں' اس لئے ان کی تیمار داری کے لئے حضور ﷺ نے آنجنابؓ کو مدینہ میں چھوڑ دیا تھا اور انہیں اس لشکر میں شامل نہیں فرمایا تھا جو اولاً تو ابو سفیان کے تجارتی قافلہ کا راستہ روکنے کے لئے نکلا تھا' لیکن بالآخر غزوۂ بدر پر منتج ہوا تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بدر کے مال غنیمت میں سے وہی حصہ مرحمت فرمایا جو دوسرے بدری صحابہ رضی اللہ عنہم کو مرحمت کیا گیا تھا۔ گویا حضور ﷺ نے آپؓ کو مجازی طور پر اس غزوہ میں شریک قرار دیا جبکہ حقیقی طور پر وہ اس میں شریک نہیں تھے۔ اس طرح کا دوسرا موقع حدیبیہ کے مقام پر پیش آیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ چونکہ وہاں موجود نہیں تھے' لہٰذا نبی اکرم ﷺ نے خود ہی اپنا ایک دست مبارک دوسرے دست مبارک کے اوپر رکھ کر ارشاد فرمایا کہ "یہ عثمانؓ کا ہاتھ ہے اور یہ عثمانؓ کی طرف سے بیعت ہے"۔ یہ درحقیقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے فضائل میں بہت بلند مقام ہے اور یہ بہت بڑی سعادت ہے جو اس روز انؓ کو حاصل ہوئی۔

پھر یہ کہ نبی اکرم ﷺ نے خون عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کے لئے حدیبیہ کے مقام پر موجود تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے جو بیعت لی یہ بھی انتہائی اعلیٰ مرتبہ ہے جو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو حاصل ہوا۔ یہ وہ بیعت ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اپنی رضامندی اور خوشنودی کا اظہار فرمایا ہے۔ اس طرح بیعت رضوان کا یہ عظیم الشان واقعہ اللہ تعالیٰ

نے اپنے کلام قرآن مجید میں ہمیشہ ہمیش کے لئے محفوظ فرمادیا ہے۔

اس بیعت کی ضرورت کیا تھی؟

انتہائی غور طلب بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو یہ بیعت لینے کی ضرورت کیا تھی! حضور ﷺ کے ساتھ جو چودہ یا پندرہ سو افراد آئے تھے ان میں سے کوئی بھی اس بیعت میں پیچھے نہیں رہا۔ صرف ایک شخص جد بن قیس کے بارے میں روایات میں آتا ہے کہ وہ اپنے اونٹ کے پیچھے چھپ کر بیٹھا ہوا تھا کہ مجھے کوئی دیکھ نہ لے۔ اس نے بیعت نہیں کی۔ اس کے سوا بقیہ تمام لوگوں نے بیعت کی۔ یہ شخص درحقیقت منافق تھا اور اس کا ذکر سفر تبوک کے ضمن میں بھی آتا ہے کہ اس موقع پر اس کا نفاق بالکل کھل کر سامنے آگیا تھا۔ حضور ﷺ کے ساتھ جو اشخاص آئے تھے ان میں جد بن قیس جیسا کوئی دوسرا شخص شاید ہی ہو۔ اگر حضور ﷺ جنگ کا فیصلہ فرمادیتے تو یقیناً ان مومنین صادقین میں سے کوئی شخص بھی کسی صورت میں پیٹھ دکھانے والا نہیں تھا۔ لیکن اس کے باوجود حضور ﷺ بیعت لے رہے ہیں تو اس میں کیا حکمت تھی؟ درحقیقت یہ اس لئے لی گئی کہ بیعت کا یہ اصول اور یہ عمل آنے والوں کی رہنمائی کے لئے سیرت مطہرہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں بحیثیت سنت ہمیشہ ہمیش کے لئے ثبت ہو جائے۔ بیعت رضوان اس بات کی روشن دلیل ہے کہ کسی موقع پر یا کسی اعلیٰ مقصد کے لئے، جیسے ہجرت و جہاد، بیعت لینا سنت ثابتہ ہے۔ ورنہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین میں کوئی شخص بھی ایسا نہ ہو سکتا تھا کہ نبی اکرم ﷺ بیعت لئے بغیر خون عثمانؓ کے قصاص کے لئے جنگ کا حکم دیتے تو اس سے اعراض کرتا۔ پھر یہی نہیں بلکہ مختلف مواقع پر انہی مخلص و صادق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مختلف امور کے لئے حضور ﷺ کا بیعت لینا احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔ چنانچہ انہی احادیث سے یہ اصول مستنبط ہوتا ہے کہ اعلائے کلمۃ اللہ، اقامت دین، اظہارِ دین الحق علی الدین کلہ اور تکبیر رب یعنی انقلاب محمدی (علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) کی جدوجہد کے لئے جو ہیئت اجتماعیہ وجود میں آئے وہ بیعت ہی کے اصول پر قائم ہو۔ یہی سنت کا تقاضا ہے۔

قریش کی طرف سے مصالحت پر آمادگی

جب قریش نے ایک طرف یہ دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کسی دھمکی سے مرعوب ہونے والے نہیں ہیں' دوسری طرف ان کے حلیم الطبع اشخاص نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا اور قریش کے سامنے خون ریزی کے ہولناک نتائج رکھے تو بالآخر ان کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ اگر کوئی مصالحت ہو جائے تو بہتر ہو گا۔ لہٰذا آخر کار انہوں نے مصالحانہ گفتگو کے لئے سہیل بن عمرو کو حضور ﷺ کے پاس بھیجنے کا فیصلہ کیا' جن کا شمار ان کے بڑے متحمل اور مدبر سرداروں میں ہوتا تھا۔ چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ کو خبر ملی کہ اس مرتبہ سہیل بن عمرو (۱) گفتگو کے لئے آئے ہیں تو حضورؐ نے فرمایا کہ اس کا مطلب ہے کہ قریش مصالحت پر آمادہ ہو گئے۔

صلح نامہ کی تحریر۔ شرائط اور چند اہم واقعات

قریش کو بیعت رضوان کی خبر پہنچ چکی تھی جس پر ان میں کافی سراسیمگی پھیل گئی تھی۔ اسی لئے انہوں نے سہیل بن عمرو کو اپنی طرف سے نمائندہ بنا کر بھیجا تاکہ وہ ایسی شرائط پر مصالحت کر لیں جو قریش کے لئے آبرومندانہ ہوں' سبکی کا باعث نہ ہوں۔ وہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مصالحت کا عندیہ ظاہر کیا۔ گفت و شنید کے بعد جب طے ہوا کہ صلح نامہ تحریر کر لیا جائے تو نبی اکرم ﷺ نے صلح نامہ تحریر (Dictate) کرانا شروع کیا۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کاتب کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ سہیل بن عمرو نے فوراً ٹوک دیا کہ نہیں!

---

(۱) فتح مکّہ کے بعد یہ سہیل بن عمرو بھی ایمان لے آئے اور حضور ﷺ کے صحابی ہونے کے شرف سے مشرف ہوئے۔ نبی اکرم ﷺ کی وفات کے فوراً بعد ارتداد کا جو فتنہ اٹھا' اس کے اثرات مکّہ تک بھی پہنچے لیکن یہ سہیل بن عمرو رضی اللہ عنہ نہ صرف خود ثابت قدم اور اسلام پر قائم رہے بلکہ چونکہ نہایت شعلہ بیان خطیب بھی تھے' لہٰذا انہوں نے اپنے مؤثر و مدلل خطبات کے ذریعہ مکّہ والوں کو اس فتنہ ارتداد سے بچانے میں اہم کردار ادا کیا۔

ہم "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" سے واقف نہیں ہیں' ہم تو ہمیشہ سے "بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ" استعمال کرتے رہے ہیں لہٰذا یہی الفاظ لکھے جائیں گے' ہم آپ کے الفاظ "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ـــــ حضور ﷺ نے فرمایا "ٹھیک ہے' لکھ دو باسمک اللّٰھم کوئی فرق واقع نہیں ہوتا"۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ لکھو کہ "یہ وہ صلح ہے جو محمد رسول اللہ (ﷺ) اور قریش کے مابین منعقد ہوئی۔" سہیل بن عمرو نے فوراً دوسرا اعتراض جڑ دیا کہ "محمد رسول اللہ" کے الفاظ نہیں لکھے جاسکتے۔ اس لئے کہ اسی بناء پر تو ہمارا سارا تنازعہ ہے۔ ظاہر ہے کہ صلح نامہ کے نیچے فریقین کے دستخط ہوں گے تو یہ پوری عبارت گویا دونوں کے مابین متفق علیہ ہوگی' اور اس میں اگر آپؐ کا نام رسول اللہ لکھا ہوا ہے تو گویا ہم نے آپ کو رسول اللہ مان لیا۔ پھر تو ہمارے اور آپ کے مابین کوئی جھگڑا اور کوئی تنازعہ ہی باقی نہ رہا۔ پھر صلح کا کیا سوال! پس آپؐ کے نام کے ساتھ رسول اللہ نہیں لکھا جائے گا"۔ سہیل بن عمرو کا یہ اعتراض قانونی اعتبار سے درست (Valid) تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے وہ کتنے ذہین اور مدبر شخص تھے ـــــ نبی اکرم ﷺ نے اس اعتراض پر مسکراتے ہوئے فرمایا کہ تم مانو یا نہ مانو' میں اللہ کا رسول ہوں۔

حضرت علیؓ کا طرزِ عمل

نبی اکرم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ "علی! محمد رسول اللہ کے الفاظ مٹا دو اور اس کی جگہ محمد بن عبداللہ لکھ دو" (ﷺ)۔ حضرت علیؓ نے جواب میں عرض کیا کہ "حضورؐ! یہ کام میں نہیں کر سکتا"۔ کہا جاسکتا ہے کہ حضرت علیؓ اس موقع پر نبی اکرم ﷺ کی حکم عدولی کر رہے ہیں کہ حضورؐ فرما رہے ہیں کہ رسول اللہ کے الفاظ مٹا دو اور وہ کہہ رہے ہیں کہ میں نہیں مٹا سکتا۔ مگر ایسا ہرگز نہیں' بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ تو حضورؐ کا نام لکھنے کے بعد اسے مٹانا سوءِ ادب خیال کرتے تھے۔ بہرحال حضورؐ نے پھر مسکراتے ہوئے فرمایا کہ کہاں ہیں وہ الفاظ؟ کیونکہ آپ ﷺ تو اُمی تھے' دنیوی طور پر لکھنا پڑھنا آپؐ نے نہیں سیکھا تھا۔ حضرت علیؓ نے وہ مقام بتایا اور حضور ﷺ نے اپنے دست

مبارک سے وہ الفاظ مٹا دیئے۔ پھر وہاں لکھا گیا کہ یہ معاہدہ محمدؐ بن عبداللہ بن عبدالمطلب اور قریش کے مابین طے پایا۔

معاہدہ کی شرائط

اس معاہدہ کی بعض شرائط نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لئے بظاہر نہایت سبکی کا باعث اور توہین آمیز تھیں۔ سہیل نے سب سے پہلے تو یہ شرط پیش کی کہ ہم یہ برداشت کر ہی نہیں سکتے کہ اس سال مسلمان عمرہ کریں۔ اس سال عمرہ کرنے کی اجازت دینے کا مطلب تو یہ ہو گا کہ پورے عالم عرب میں یہ بات مشہور ہو جائے کہ محمدؐ (ﷺ) کی بات پوری ہو گئی اور قریش کو جھکنا پڑا اور ہتھیار ڈالنے پڑے۔ لہٰذا اس سال تو آپؐ کو یہیں سے واپس جانا ہو گا۔ البتہ اگلے سال آپؐ تشریف لے آیئے' ہم تین دن کے لئے مکّہ کو خالی کر دیں گے' ہم پہاڑوں پر چلے جائیں گے اور مکّہ آپؐ کی disposal پر ہو گا۔ آپؐ وہاں رہئے اور عمرہ کیجئے' مکّہ والے وہاں رہیں گے ہی نہیں تاکہ کوئی شخص جذبات سے مشتعل ہو کر کوئی اقدام نہ کر بیٹھے۔ اس تصادم کے امکان کو بھی روک دیا جائے گا۔ البتہ آپؐ کے ساتھ تلواریں اگر ہوں گی تو وہ نیام میں ہوں گی اور نیام بھی تھیلوں میں بند ہوں گے۔ تھیلے احرام کی حالت ہی میں ہاتھ میں رہیں گے۔ یہ نہیں ہو گا کہ تلواریں نیام میں ساتھ لٹکی ہوئی ہوں۔ دوسری شرط یہ تھی کہ دس سال تک ہمارے اور آپؐ کے مابین بالکل امن رہے گا' کوئی جنگ نہیں ہو گی۔ تیسری شرط یہ طے ہوئی کہ عرب کے دوسرے قبائل میں سے جو چاہے ہمارا حلیف بن جائے اور جو چاہے آپؐ کا حلیف بن جائے۔ فریقین کے حلیف بھی امن و امان سے رہیں گے اور ان کے مابین بھی جنگ و جدال بالکل نہیں ہو گی۔ بنو خزاعہ کے سردار بدیل بن ورقہ نے وہیں پر اعلان کیا کہ ہم محمدؐ (ﷺ) کے ساتھ ہیں۔ ایک دوسرا قبیلہ بنو بکر' جس کو بنو خزاعہ سے پرانی دشمنی تھی' اس نے فوراً دوسرا رخ اختیار کر لیا کہ ہم اس معاہدہ کی رو سے قریش کے حلیف ہیں۔ معاہدہ کی چوتھی شرط مسلمانوں کے لئے بظاہر بہت توہین آمیز اور دل آزاری کا باعث تھی۔ وہ یہ کہ اگر مکّہ کا کوئی شخص اپنے والی یا سرپرست کی اجازت کے بغیر مدینہ جائے گا تو

مسلمانوں کو اسے واپس لوٹانا ہوگا' لیکن مدینہ سے اگر کوئی شخص مکّہ آجائے گا تو اسے ہم واپس نہیں کریں گے۔ یہ بڑی غیر منصفانہ (Un-Equal) شرط تھی جس پر سہیل بن عمرو کا اصرار تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس پر بڑے جز بز ہوئے اور ان کے جذبات میں جوش و ہیجان پیدا ہوا کہ ہم یہ صورت کیوں گوارا کر رہے ہیں؟ ہم دب کر اور گر کر کیوں صلح کریں؟ ہم اس وقت چودہ سو کی تعداد میں موجود ہیں اور ہمیں تو شہادت کی موت مطلوب ہے' ہم بیعت علی الموت کر چکے ہیں اور ہم سب کے سب کلمہ حق کے لئے اپنی گردنیں کٹوانے کے لئے تیار ہی نہیں بے تاب ہیں۔ لہٰذا ہم ان شرائط پر صلح کیوں کریں جو سہیل منوانا چاہتے ہیں؟ یہ بظاہر احوال گر کر اور دب کر صلح کرنے کے مترادف معاملہ تھا ـــــ صحابہ کرامؓ کے یہ جذبات تھے لیکن سب کے سب مہربلب تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اضطراب

یہ وہ لمحات ہیں جن کے متعلق ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے جذبات کا کیا عالم ہوگا! یہ وہ وقت ہے کہ دینی حمیت و غیرت کے باعث حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اضطراب اتنا بڑھا کہ ان کے ہاتھ سے صبر کا دامن چھوٹ گیا اور انہوں نے آگے بڑھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ مکالمہ کیا جو سیرت کی تمام مستند کتابوں میں مذکور ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ حضرت عمرؓ کو قدرت کی طرف سے جلالی طبیعت ودیعت ہوئی تھی۔ اسلام کی دولت سے مالا مال ہونے کے بعد آپؓ کی اس کیفیت میں کافی اعتدال آگیا تھا لیکن کبھی کبھار دین کی حمیت کے باعث اس جلالی طبیعت کا غلبہ ہو جاتا تھا۔ دراصل یہی سبب تھا کہ انہوںؓ نے ذرا تیکھے انداز میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس موقع پر گفتگو کی' جس کا انؓ کو ساری عمر تاسف رہا ہے اور انہوںؓ نے اپنے اس انداز گفتگو کے کفارہ کے طور پر نہ معلوم کتنی نفلی عبادات کی تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا "حضورؐ کیا آپؐ حق پر نہیں ہیں اور کیا آپؐ اللہ کے نبی نہیں ہیں؟" نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکراتے ہوئے جواب میں ارشاد فرمایا "یقیناً میں حق پر ہوں اور میں اللہ کا نبی ہوں۔" پھر حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ "حضورؐ! پھر ہم اس طرح کا معاملہ کیوں کر رہے ہیں؟ کیا اللہ ہمارے ساتھ نہیں ہے؟؟"

حضورؐ نے پھر مسکراتے ہوئے ہوئے فرمایا "اللہ میرے ساتھ ہے اور میں اس کا نبی ہوں اور میں وہی کچھ کر رہا ہوں جس کا مجھے حکم ہے"۔ نبی اکرم ﷺ کا تبسم کے ساتھ جوابات کا انداز بتا رہا ہے کہ حضرت عمرؓ کے اس انداز تخاطب سے آپؐ قطعاً ناراض نہیں ہوئے تھے۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا جواب

ظاہر بات ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے جوابات سن کر حضرت عمرؓ کو حضورؐ سے تو مزید کچھ کہنے کی جرأت نہیں ہوئی' لیکن طبیعت میں جو ایک تلاطم' ایک طوفان اور ایک ہیجانی کیفیت تھی وہ برقرار رہی۔ چنانچہ وہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس گئے جو اُس وقت اس خیمہ میں موجود نہیں تھے۔ انؓ سے بھی اسی نوع کا مکالمہ ہوا۔ حضرت عمرؓ نے کہا "کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟ اور کیا محمد ﷺ اللہ کے رسول نہیں ہیں؟"۔ انہوں نے فرمایا کہ "کیوں نہیں' یقیناً ہم حق پر ہیں اور حضورؐ اللہ کے رسول ہیں"۔ حضرت عمرؓ نے پھر وہی بات کہی جو حضورؐ سے عرض کر چکے تھے کہ "پھر یہ کیا ہو رہا ہے اور ہم کیوں دب کر صلح کر رہے ہیں؟" اس پر حضرت ابوبکرؓ نے جواب میں بعینہٖ وہی الفاظ کہے کہ "بے شک ہم حق پر ہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور آپ وہی کرتے ہیں جس کا آپؐ کو حکم ہوتا ہے"۔ یہ ہے مقام صدیقیت ـــــ اور یہ کہ نبی اور صدیق کے مزاج میں بہت قرب ہوتا ہے۔

ایک مخصوص گروہ کی اتہام طرازی اور اس کا ازالہ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنے اس رویہ پر جو بظاہر گستاخانہ معلوم ہوتا ہے ساری عمر پشیمانی اور تاسف رہا اور آپؓ کفارہ کے طور پر ساری عمر متعدد نفلی عبادات کا اہتمام کرتے رہے' لیکن ایک خاص گروہ اس واقعہ کو لے اڑا ہے اور اس کی بناء پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو متہم کرتا اور سب وشتم کا نشانہ بناتا چلا آ رہا ہے کہ وہ (معاذ اللہ) بڑے گستاخ تھے۔ اس خاص گروہ کی طرف سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شان میں گستاخیاں کرنے اور انہیں متہم کرنے کے لئے اس واقعہ کو بھی نمک مرچ لگا کر خوب اچھالا جاتا ہے۔ مگر وہ لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ اگر اس معنی و مفہوم میں یہ بات لی جائے گی تو گویا بات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ذات تک

محدود نہیں رہے گی بلکہ اس کی زد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذات گرامی بھی آجائے گی کہ انہوں نے بھی ایک موقعہ پر نبی اکرم ﷺ کے حکم سے سرتابی کی۔ حالانکہ دنیا کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ "الامر فوق الادب" یعنی حکم ادب سے بالاتر ہے۔ جب حکم دیا جارہا ہو تو ادب و تعظیم کا معاملہ پیچھے رہ جائے گا' حکم پر بہرصورت عمل کیا جائے گا ـــــ لیکن معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نیت میں کوئی خلل تھا اور نہ ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نیت میں کوئی فتور۔ ان دونوں جلیل القدر اصحابِ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم و رضی اللہ تعالیٰ عنہما) کے دلوں میں نہ بغاوت و سرتابی کے جراثیم تھے اور نہ ہی گستاخی کا کوئی ارادہ تھا' بلکہ درحقیقت یہ حمیت حق تھی جس کی وجہ سے حضور ﷺ کے اس فرمان پر کہ "رسول اللہ" کا لفظ صلح نامہ سے مٹادو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہو گئے کہ "میں تو یہ کام کرنے والا نہیں ہوں"۔ اور اسی حمیت حق کے سبب سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایسا انداز گفتگو اختیار کیا۔ ان دونوں حضرات کرام رضی اللہ عنہما کے اس طرز عمل پر نبی اکرم ﷺ نے نہ کوئی سرزنش فرمائی نہ ہی اظہارِ ناراضگی و ناپسندیدگی فرمایا' بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ مجھے بتاؤ کہ "رسول اللہ" کے الفاظ کہاں مرقوم ہیں' اور پھر اپنے دست مبارک سے اسے مٹادیا۔ پہلے ذکر ہو چکا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے تیکھے انداز میں کئے گئے تمام سوالات کے جوابات نبی اکرم ﷺ نے تبسم کے ساتھ ارشاد فرمائے۔ یہ تمام باتیں اس امر کی علامت ہیں کہ نبی ﷺ ان حضرات گرامیؓ کے جذبات کی صحیح نوعیت سے بخوبی آگاہ تھے۔

ابوجندلؓ کی آمد

اِدھر جذبات کا یہ عالم تھا اُدھر ان سلگتے ہوئے جذبات پر اس واقعہ نے تیل کا کام کیا کہ سہیل بن عمرو کے صاحبزادے ابو جندل رضی اللہ عنہ مکّہ میں ایمان لا چکے تھے اور سہیل نے ان کو زنجیروں اور بیڑیوں میں جکڑ کر ایک کوٹھڑی میں بند کر رکھا تھا۔ سہیل اور قریش کے دوسرے لوگ انؓ کو بہت مارا کرتے تھے تاکہ وہ اس تشدد سے گھبرا کر اپنے آبائی بت پرستی کے دین کی طرف لوٹ آئیں۔ انہیںؓ جب پتہ چلا کہ نبی اکرم ﷺ حدیبیہ کے مقام

پر مقیم ہیں جو مکہ سے چودہ پندرہ میل کے فاصلہ پر واقع ہے تو انہوں نے کسی نہ کسی طرح اپنی بیڑیاں تڑوائیں اور چھپتے چھپاتے حدیبیہ میں حضور ﷺ کی خدمت میں پہنچ گئے۔ ابھی اس معاہدہ کی سیاہی بھی خشک نہیں ہوئی تھی کہ اس موقع پر ابو جندل رضی اللہ عنہ وہاں اس حالت میں پہنچے کہ ان کے ہاتھوں میں زنجیریں پڑی ہوئی تھیں' جسم پر تشدد کے نشان تھے۔ وہ آئے اور نبی اکرم ﷺ کے قدموں میں لیٹ گئے۔ سہیل بن عمرو نے فوراً کہا یہ ہے پہلا معاملہ' صلح کی جو شرائط ہمارے مابین طے ہو چکی ہیں ان کے مطابق آپ ابو جندلؓ کو میرے حوالے کر دیجئے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ "شرائط ضرور طے ہو گئی ہیں لیکن تم ان کو تو ہمارے ساتھ رہنے کی اجازت دے دو"۔ سہیل نے کہا "قطعاً نہیں' اسے آپ کو بہرصورت واپس کرنا ہو گا"۔ حضورؐ نے پھر فرمایا "سہیل تم اس کو یہیں رہنے دو۔" اس نے فوراً کہا کہ "پھر ہمیں کوئی صلح نہیں چاہئے' صلح کی شرائط کالعدم سمجھئے' اب تلوار ہی ہمارے درمیان فیصلہ کرے گی"۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ "اچھا تم نہیں مانتے تو ٹھیک ہے' صلح کی شرائط باقی رہیں گی' جنگ سے صلح بہتر ہے"۔ ادھر ابو جندلؓ چیخ رہے ہیں اور اب انہوں نے خیمہ میں موجود مسلمانوں سے استغاثہ کیا کہ "مسلمانو! مجھے کن بھیڑیوں کے حوالہ کر رہے ہو؟" ـــــ اندازہ کیجئے اُس وقت جذبات کا کیا عالم ہو گا! سب کے دل مجروح تھے لیکن جوش سے لبریز تھے۔ سینوں میں دل بے تاب تھے کہ رسول اللہ ﷺ کا ذرا سا بھی اشارہ ہو جائے تو تلواریں نیام سے نکل آئیں ـــــ واقعہ یہ ہے کہ یہ مرحلہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی اطاعت شعاری کا بڑا کڑا' بڑا شدید اور بڑا نازک امتحان تھا جس سے اللہ تعالیٰ ان کو گزار رہا تھا۔

نبی اکرم ﷺ کی حضرت ابو جندلؓ کو نصیحت

سہیل بن عمرو کی ضد اور اصرار کو دیکھ کر نبی اکرم ﷺ نے فیصلہ صادر فرما دیا کہ ابو جندلؓ کو سہیل کے حوالہ کر دیا جائے اور ان سے مخاطب ہو کر فرمایا: ابو جندل صبر کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اور دوسروں کے لئے جو انہی حالات میں مظلومانہ طور پر مقید ہیں کوئی نہ کوئی راستہ نکال دے گا' ہم صلح کی شرائط طے کر چکے ہیں اور ان کی رو سے ہم پابند

ہیں کہ تمہیں واپس کردیں۔ چنانچہ سہیل اپنے بیٹے کو اپنے ساتھ واپس لے گئے۔

صحابہ کرامؓ کا غیر معمولی طرزِ عمل

اب جبکہ صلح ہو گئی' اس پر دستخط ثبت ہو گئے اور سہیل واپس چلے گئے تو نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ "اب اٹھو' قربانی کے لئے جو جانور ساتھ لائے ہو ان کی یہیں پر قربانیاں دے دو اور احرام کھول دو۔" اُس وقت مسلمانوں کے جذبات کا جو عالم تھا اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا ——— ہوا یہ کہ ان میں سے ایک شخص بھی نہیں اٹھا۔ جذبات کی یہ کیفیت تھی کہ گویا ان کے اعصاب و اعضاء بالکل شل ہو گئے اور ان میں حرکت کرنے کی بھی طاقت نہیں رہی' ان کے دل اس درجہ بجھے ہوئے تھے۔ ان کا جوش و خروش تو یہ تھا کہ وہ جان نثاری اور سرفروشی دکھائیں اور اللہ کے دین کی راہ میں گردنیں کٹوا کر سرخرو ہو جائیں' جیسا کہ سورۃ الاحزاب میں وارد ہے :

﴿ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًاۙ ﴾ (الاحزاب : ۲۳)

"اہل ایمان میں کتنے جواں مرد ہیں کہ جنہوں نے جو عہد اپنے پروردگار سے کیا تھا اسے پورا کر دکھایا۔ پس ان میں وہ بھی ہیں جو اپنا ہدیہ جان پیش کر چکے (اپنی نذر اللہ کے حضور میں گزار چکے) اور کتنے ہیں جو منتظر ہیں (کہ کب ہماری باری آئے اور ہم بھی جانیں دے کر سرخرو ہو جائیں) اور انہوں نے اپنے عہد میں کوئی تبدیلی نہیں کی"۔

معلوم ہوا کہ اُس وقت حضرت علی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے جو جذباتی کیفیت صادر ہوئی وہ صرف ان دونوں کی نہیں تھی بلکہ تمام مسلمانوں کی تھی۔ سب ہی دل شکستہ تھے۔ یہ منظر ناقابل تصور ہے کہ نبی اکرم ﷺ حکم دے رہے ہیں کہ "اٹھو! قربانیاں دے کر احرام کھول دو" ——— اور کوئی ایک شخص بھی نہیں اٹھ رہا۔ آپؐ نے دوسری مرتبہ حکم دیا کہ "اٹھو' یہیں قربانیاں کرو اور احرام کھول دو" مگر پھر بھی کوئی نہیں اُٹھا۔ صحابہؓ کے ذہن میں تو یہ تھا کہ ہم مکہ جائیں گے' کعبہ کا طواف اور سعی کریں گے اور پھر قربان گاہ میں قربانیاں کریں گے ——— جو جانور ساتھ ہیں وہ تو ہدی ہے کعبہ کی ——— اب یہاں

پر ہم قربانیاں کیسے کر دیں۔ حضور ﷺ نے تیسری مرتبہ پھر فرمایا "اٹھو' قربانیاں دے دو اور احرام کھول دو" مگر کسی نے جنبش نہیں کی۔ یہ اس لئے ہوا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جذباتی کیفیت ایسی تھی کہ وہ اس صورت حال کے لئے ذہناً تیار نہیں تھے۔ وہ اپنی جانیں دینے اور گردنیں کٹوانے کے لئے تو تیار تھے' لیکن جن شرائط پر صلح ہوئی تھی اسے ان کے اعصاب اور مزاج قبول نہیں کر رہے تھے۔

اُمّ المومنین حضرت اُمّ سلمہؓ کا مدبرانہ مشورہ

روایات میں آتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کچھ ملول ہو کر اپنے خیمہ میں تشریف لے گئے۔ حضور ﷺ کا یہ معمول تھا کہ سفر میں ایک زوجہ محترمہ کو ساتھ رکھتے تھے۔ سفر کے موقع پر قرعہ اندازی ہوتی تھی کہ اس مرتبہ کون ساتھ جائے گا۔ اِس سفر میں ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا حضور ﷺ کے ساتھ تھیں۔ حضورؐ خیمہ میں تشریف لے گئے اور حضرت ام سلمہؓ سے ذکر کیا کہ میں نے مسلمانوں سے تین مرتبہ کہا کہ "اٹھو' قربانیاں دے دو اور احرام کھول دو" لیکن کوئی ایک شخص بھی نہیں اٹھا ـــــ اس پر انہوں نے عرض کیا کہ حضورؐ آپ زبان سے کچھ نہ فرمایئے' آپؐ خیمہ سے باہر تشریف لے جایئے' قربانی دیجئے اور حلق کرا کے احرام کھول دیجئے ـــــ نبی اکرم ﷺ نے اس مشورہ پر عمل کیا' باہر تشریف لائے' قربانی دی' سر کے بال منڈوائے اور بعدہ احرام کھول دیا۔

صحابہ کرامؓ کا ردِّ عمل اور اس کی تاویل

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جب یہ سب کچھ دیکھ لیا تو اب سب کے سب کھڑے ہو گئے' جو حضرات ہدی کے جانور ساتھ لائے تھے انہوں نے قربانیاں دیں اور تمام صحابہ کرامؓ نے حلق یا قصر کرایا اور احرام کھول دیئے۔

اس صورت حال کی تاویل یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر ابھی تک ایک حالت منتظرہ طاری تھی۔ وہ اس خیال میں تھے کہ شاید صورت حال بدل جائے۔ شاید اللہ تعالیٰ کی طرف سے نئی وحی آ جائے!! ـــــ جب تک یہ صورت سامنے نہیں آئی کہ نبی اکرم ﷺ نے خود قربانی دینے اور حلق کرانے کے بعد احرام کھول دیا تو اُس وقت تک ان کے

ذہنوں میں صورت حال کی تبدیلی کا ایک امکان برقرار تھا کہ جس کے وہ شاید انتظار میں تھے۔ لیکن جب نبی ﷺ نے احرام کھول دیا تو صحابہ کرامؓ جان گئے کہ یہی آخری فیصلہ ہے۔ چنانچہ حالت منتظرہ ختم ہو گئی اور سب نے احرام کھول دیئے۔ عمرہ کی جو نیت کی ہوئی تھی اسے اگلے سال کے لئے مؤخر کرتے ہوئے نبی اکرم ﷺ اور تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حدیبیہ سے مدینہ کی طرف مراجعت فرمائی۔

یہ صلح کن اعتبارات سے فتح مبین تھی!

اس اہم واقعہ کو قرآن مجید نے فتح مبین قرار دیا اور حدیبیہ سے واپسی پر یہ آیت نازل ہوئی کہ ﴿ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ﴾ "بے شک ہم نے (اے محمد ﷺ) آپ کے لئے تابناک اور کھلی فتح کا فیصلہ فرمایا"۔ صلح حدیبیہ کو رسول اللہ ﷺ کی انقلابی جدوجہد کے ضمن میں ایک نہایت اہم موڑ (Turning Point) کی حیثیت حاصل ہے۔ درحقیقت اس صلح اور معاہدہ کا مطلب یہ تھا کہ قریش نے نبی اکرم ﷺ کو ایک "طاقت" کی حیثیت سے تسلیم (Recognise) کر لیا۔ سیاسیات اور بین الاقوامی معاملات میں دراصل یہی بات فیصلہ کن ہوتی ہے کہ اگر کسی فریق کی قانونی و آئینی حیثیت تسلیم کر لی جائے تو اس کے لئے یہ ایک بہت بڑی کامیابی ہوتی ہے۔ کیونکہ اس فریق کو بہت سے حقوق و تحفظات حاصل ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا قریش کی طرف سے مصالحت پر آمادہ ہو جانے اور ایک باضابطہ تحریری شکل میں نبی اکرم ﷺ کے ساتھ صلح کا معاہدہ کر لینے کا مطلب یہ ہے کہ گویا قریش نے یہ تسلیم کر لیا کہ محمد (ﷺ) عرب کی ایک سیاسی اور عسکری طاقت ہیں جن سے انہوں نے صلح کا معاہدہ کیا ہے۔ یعنی قریش کو تسلیم کرنا پڑا کہ محمد (ﷺ) اب ایک ایسی طاقت ہیں جنہیں تسلیم کئے بغیر اب کوئی چارۂ کار نہیں۔ اس صورت حال کے پس منظر میں مدینہ منورہ کی واپسی کے سفر کے دوران سورۃ الفتح کی درج ذیل آیات نازل ہوئیں:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ۭ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ ... ﴾

(آیت ۱۰)

"بے شک جو لوگ (اے محمد ﷺ) آپ سے بیعت کرتے ہیں وہ (درحقیقت) اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔ اللہ کا ہاتھ ہے ان کے ہاتھ کے اوپر..."

اور

﴿ لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ..... ﴾

(آیت ۱۸)

"تحقیق اللہ راضی ہو گیا ایمان والوں سے جب وہ بیعت کرنے لگے (اے نبیؐ) آپ سے درخت کے نیچے....."

اور

﴿ لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ لَا تَخَافُوْنَ..... ﴾

(آیت ۲۷)

"بے شک اللہ نے سچ کر دکھایا اپنے رسول کو خواب حق کے ساتھ۔ تم لازماً داخل ہو کر رہو گے مسجد حرام میں اگر اللہ نے چاہا آرام سے اپنے سروں کے بال مونڈتے اور کترتے ہوئے' بے کھٹکے..."

جب یہ آیات نازل ہوئیں اور اہل ایمان کے سامنے ان کی تلاوت کی گئی تو ان آیات نے گویا ان کے زخمی دلوں پر مرہم کے پھاہے کا کام کیا۔ اہل ایمان جس چیز کو اپنے خیال میں شکست سمجھتے تھے' اللہ تعالیٰ نے اس کو فتح مبین قرار دیا۔ اس سے مسلمانوں کے دل مسرت و شادمانی سے باغ باغ ہو گئے۔ صحیح مسلم میں روایت موجود ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ آں حضرت ﷺ نے پہلے خاص طور پر حضرت عمرؓ کو بلا کر ان کو بتایا کہ یہ سورت نازل ہوئی ہے۔ انہوں نے پہلے تو کچھ تعجب کا اظہار کیا لیکن جب حضور ﷺ نے فرمایا کہ ہاں اللہ تعالیٰ نے اسے فتح مبین قرار دیا ہے تو ان کے دل بے قرار کو بھی قرار آ گیا اور وہ بھی شاداں و فرحاں ہو گئے۔

حضرت ابوجندلؓ کا دوسرا اقدام

نبی اکرم ﷺ نے معاہدہ کی شرط کے مطابق اور سہیل بن عمرو کے اصرار پر ابوجندلؓ

کو کفار کے حوالہ کر دیا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد وہؓ اپنی قید سے دوبارہ نکلے۔ مدینہ منورہ تو اس لئے نہیں گئے کہ انہوںؓ نے اچھی طرح جان لیا تھا کہ نبی اکرم ﷺ تو معاہدہ کی وجہ سے پابند ہیں لہٰذا آپؐ تو مجھے دوبارہ واپس بھجوا دیں گے۔ چنانچہ انہوں نے بحیرہ احمر کا رخ کیا اور ساحل کے قریب جنگل میں پناہ لی۔ اس کے بعد ایک اور صحابی عتبہ بن اسید رضی اللہ عنہ، جو اپنی کنیت ابو بصیر کے حوالے سے زیادہ مشہور ہیں، وہ بھی مکّہ والوں کی قید سے چھٹکارا پا کر مدینہ پہنچے۔ ان کے مدینہ پہنچتے ہی مکّہ سے دو اشخاص ان کے پیچھے پہنچے اور حضورؐ سے مطالبہ کیا کہ ابو بصیرؓ کو اپنے معاہدے کی رُو سے ہمارے حوالے کیجئے۔ نبی اکرم ﷺ نے حضرت ابو بصیرؓ کو واپس جانے کا حکم دیا اور انہیںؓ ان دونوں ایلچیوں کے حوالے کر دیا۔ ابھی یہ تینوں ذوالحلیفہ ہی پہنچے تھے کہ ابو بصیرؓ نے موقع پا کر انہی دو میں سے ایک کی تلوار پر قبضہ کر کے اس کی گردن اڑا دی۔ دوسرا مدینہ کی طرف سرپٹ بھاگا۔ پیچھے پیچھے ابو بصیرؓ بھی مدینہ پہنچ گئے۔ مکّہ والا حضورؐ سے فریاد کر رہا تھا کہ ابو بصیرؓ نے آ کر عرض کیا کہ حضورؐ آپ نے تو اپنا وعدہ پورا کر دیا تھا، میں نے تو اب ایک کو قتل کر کے آزادی حاصل کی ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ یہ شخص پھر کہیں جنگ کی آگ نہ بھڑکا دے، کوئی ہے جو اس کو قابو میں کرے! یہ سننا تھا کہ ابو بصیر رضی اللہ عنہ وہاں سے بھاگے اور مدینہ سے نکل کر بحر احمر کے ساحلی جنگل میں جا کر حضرت ابو جندل رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل گئے۔ اس کے بعد جب مکّہ کے بے کس اور مظلوم مسلمانوں کو پتہ چلا کہ جان بچانے کا ایک دوسرا ٹھکانا بن گیا ہے تو چوری چھپے مکّہ سے فرار ہو کر مدینہ کا رخ کرنے کے بجائے یہاں پناہ کے لئے پہنچنے کا سلسلہ شروع ہو گیا اور تھوڑے ہی دنوں میں وہاں ایک اچھی خاصی جمعیت فراہم ہو گئی۔ اب انہوں نے قریش کے ان تجارتی قافلوں پر جو شام کے لئے بحر احمر کے ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کرتے تھے حملے شروع کر دیئے اور قافلوں کو لوٹنا شروع کر دیا، اس لئے کہ یہ لوگ مدینہ میں تو تھے نہیں لہٰذا حضور ﷺ کی صلح کی شرائط کے پابند نہیں تھے۔ تجارتی قافلوں کے یہ راستے قریش کی معیشت کے لئے شہ رگ کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان لوگوں کے حملوں اور لوٹ مار کے ہاتھوں مجبور ہو کر قریش کا ایک وفد ان کی طرف سے تحریر لے کر مدینہ آیا کہ معاہدہ کی اس شرط کو ہم خود واپس لیتے ہیں۔ اب مکّہ

سے جو بھی آپؐ کے پاس مدینہ آکر آباد ہونا چاہے وہ آسکتا ہے' ہم اس کی واپسی کا مطالبہ نہیں کریں گے۔ آپؐ ابو جندلؓ' ابو بصیرؓ اور ان کے ساتھیوں کو مدینہ بلا لیجئے ـــــ حضور ﷺ نے ان کو فرمان بھیجا اور وہ سب کے سب مدینہ آکر آباد ہو گئے اور قریش کے قافلوں کا راستہ بدستور محفوظ و مامون ہو گیا۔

الغرض کہ صلح کی اس شق سے جو اہل ایمان کو سب سے زیادہ شاق گزری تھی خود قریش کو تائب ہونا پڑا۔ گویا ﴿ إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا ﴾ کا ایک نظارہ بہت ہی جلد مسلمانوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ـــــ اور نبی اکرم ﷺ نے حدیبیہ کے مقام پر حضرت ابو جندلؓ کو واپس کرتے ہوئے جو الفاظ مبارکہ فرمائے تھے کہ : ((یا اباجندل اصبر واحتسب' فان اللّٰہ جاعلٌ لک ولمن معک من المستضعفین فرجًا و مخرجًا)) "اے ابو جندل! صبر اور ضبط سے کام لو' اللہ تمہارے لئے اور تمہارے ساتھ دوسرے ضعیفوں اور مظلوموں کے لئے کوئی راہ نکال دے گا" تو نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ایک حقیقی واقعہ کی شکل میں متشکل ہو کر نگاہوں کے سامنے آگیا۔

صلح حدیبیہ کے ثمرات

اس صلح کے بعد نبی اکرم ﷺ کو یک سُو ہو کر اپنی دعوتی سرگرمیوں پر پوری توجہ دینے کا موقع مل گیا۔ یہی وہ زمانہ ہے کہ اصحابِ صُفہ کی جو جماعت تیار ہو رہی تھی حضور ﷺ نے ان کے وفود بنا بنا کر مختلف قبائل کی طرف بھیجنے شروع فرمائے۔ مزید برآں اب تک مسلمان اور مشرکین کا آپس میں کسی قسم کا کوئی رابطہ نہیں تھا۔ اس صلح کے بعد یہ روک ٹوک اُٹھ گئی تو آمد و رفت شروع ہوئی۔ خاندانی اور تجارتی تعلقات و روابط کی وجہ سے کفارِ مکّہ مدینہ منورہ آتے' وہاں طویل عرصہ تک قیام کرتے۔ اس طرح مسلمانوں سے میل جول رہتا اور باتوں باتوں میں اسلام کی دعوت توحید اور دیگر عقائد و مسائل کا تذکرہ اور ان پر تبادلہ خیال ہوتا رہتا تھا۔ ہر مسلمان اخلاص اور حسن عمل کا پیکر' نیکوکاری' حسن معاملات اور پاکیزہ اخلاق کی زندہ تصویر تھا۔ جو مسلمان مکّہ جاتے تھے' ان کی صورتیں' ان کے اعمال' ان کے اخلاق اور ان کے معاملات یہی مناظر پیش کرتے۔ ان

اوصاف کی وجہ سے مشرکین مکّہ کے دل خود بخود اسلام کی طرف کھنچے چلے آتے۔ الغرض اس صلح کے نتیجہ میں اسلام جنگل کی آگ کی طرح پھیلنے لگا۔ مؤرخین اور سیرت نگاروں کا بیان ہے کہ اس صلح سے لے کر فتح مکّہ تک اس کثرت سے لوگ اسلام لائے کہ اس سے قبل نہیں لائے تھے۔

خالد بن ولید اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کا قبول اسلام

صلح حدیبیہ کو اللہ تعالیٰ نے "فتح مبین" قرار دیا ہے' لیکن یہ اجسام کی نہیں قلوب کی فتح و تسخیر کا معاملہ تھا۔ اس مرحلہ پر اسلام کو اپنی دعوت کی اشاعت کے لئے امن درکار تھا جو اس صلح سے حاصل ہو گیا۔ دعوتِ توحید کی وسعت کو دیکھ کر خود قریش یہ سمجھنے لگے تھے کہ یہ ہماری شکست اور جناب محمّد رسول اللہ ﷺ کی فتح ہے۔ صلح حدیبیہ سے قبل قریش اور اہل ایمان کے مابین ہونے والے معرکوں میں قریش کی صفوں میں ایک جنگجو اور باصلاحیت شہسوار کی حیثیت سے خالد بن ولید کا نام ممتاز نظر آتا ہے۔ جنگ کے دوران گھڑسوار دستوں کی قیادت انہی کے سپرد رہتی تھی۔ غزوۂ احد کے موقع پر ان ہی کی تدبیر سے قریش کی شکست فتح میں بدل گئی تھی اور مسلمانوں کو شدید نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ حدیبیہ کے موقع پر بھی قریش نے گھڑسواروں کا ایک دستہ ان کی زیر کمان نبی اکرم ﷺ کا راستہ روکنے کے لئے بھیجا تھا۔ آپؐ کو اطلاع مل گئی اور آپؐ نے راستہ بدل دیا' ورنہ خالد بن ولید تو حضورؐ کا راستہ روکنے کے لئے رابغ سے بھی آگے نکل گئے تھے۔ حضورؐ نے مسلمانوں کے ساتھ حدیبیہ کے مقام پر قیام کیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جگہ جگہ پڑاؤ ڈال رکھے تھے۔ خالد بن ولید کو جب پتہ چلا تو وہ بھی اپنے گھڑسواروں کے دستہ کے ساتھ پلٹ کر حدیبیہ پہنچ گئے۔

یہاں پہنچ کر خالد بن ولید کی طرف سے ایک انوکھے طرز عمل کا مظاہرہ ہوا۔ یہ ایک ایسے پڑاؤ پر پہنچ گئے جہاں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے دو ڈھائی سو کی نفری فروکش تھی۔ خالد نے انتہائی کوشش کی کہ کسی طرح یہ اہل ایمان مشتعل ہو جائیں اور کسی مسلمان کا ایک مرتبہ ذرا ہاتھ اُٹھ جائے۔ قریش کی کچھ روایات تھیں جن سے انحراف خالد کے لئے

ممکن نہ تھا۔ چونکہ نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم احرام کی حالت میں تھے اور ان کی قدیم روایات چلی آرہی تھیں کہ محرم پر ہاتھ نہ اٹھایا جائے' اس لئے خالد بن ولید جنگ کی پہل نہیں کرنا چاہتے تھے۔ لیکن انہوں نے اشتعال انگیزی کی حتی الامکان کوشش کی۔ وہ اپنے گھوڑے لے کر بار بار صحابہؓ کی اس جماعت پر ایسے چڑھ چڑھ کر آئے جیسے ان کو گھوڑوں کے سموں سے کچل دیں گے۔ انہوں نے کئی بار اس عمل کو دہرایا' لیکن جو حکم تھا جناب محمد رسول اللہ ﷺ کا صحابہ کرامؓ اس پر کاربند رہے۔ نہ کوئی ہراساں ہوا' نہ کوئی بھاگا اور نہ ہی کسی نے مدافعت کے لئے ہاتھ اٹھایا۔ نظم وضبط کے اس مشاہدہ کا خالد بن ولید پر اتنا گہرا اثر ہو چکا تھا کہ وہ زیادہ دیر تک مزاحمت نہیں کر سکے اور ان کا گھائل دل بالآخر مسخر ہوا' جس کا ظہور صلح حدیبیہ کے بعد ہوا اور وہ مشرف بہ ایمان ہونے کے لئے عازم مدینہ ہوئے۔ ایمان لانے کے بعد یہی خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ "سَیْفٌ مِنْ سُیُوْفِ اللّٰہِ" قرار پائے۔

حضرت خالد بن ولیدؓ جب سوئے مدینہ چلے تو راستہ میں حضرت عمرو بن العاص مل گئے جو قریش کے ایک اعلیٰ مدبر' شجاع و دلیر اور فنون حرب کے بہت ماہر تسلیم کئے جاتے تھے۔ یہی وہ صاحب تھے جن کو ۵ نبوی میں حبشہ ہجرت کر جانے والے مہاجرین کی بازیابی کے لئے قریش نے سفیر بنا کر جناب نجاشیؓ کے دربار میں حبشہ بھیجا تھا۔ حضرت خالدؓ نے دریافت کیا کہ کہاں کا قصد ہے؟ بولے: اسلام قبول کرنے کے لئے مدینہ جا رہا ہوں۔ میرے دل نے تسلیم کر لیا ہے کہ محمد (ﷺ) اللہ کے رسول برحق ہیں اور اسلام اللہ کا نازل کردہ دین ہے۔ حضرت خالدؓ نے کہا: اپنا بھی یہی حال ہے ـــــ چنانچہ قریش کے یہ دونوں مایہ ناز اور جلیل القدر فرزند بارگاہ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں حاضر ہوئے اور دولت ایمان سے مشرف ہوئے۔ اور اس طرح وہ جوہر جو اُس وقت تک اسلام کی مخالفت میں صرف ہو رہا تھا' اب اسلام کی محبت اور اس کی اشاعت و توسیع میں صرف ہونے لگا۔ حضرت خالد بن ولیدؓ اور حضرت عمرو بن العاص (رضی اللہ عنہما) نے دورِ نبوت اور بعد ازاں دورِ خلافت صدیقی و فاروقی میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ رہتی دنیا تک بھلائے نہیں جا سکتے۔ اول الذکر کا دنیا کے عظیم ترین جرنیلوں میں شمار ہوتا ہے۔ دورِ

صدیقی میں فتنہ ارتداد کی سرکوبی میں انہوں نے ہی فیصلہ کن کردار ادا کیا تھا۔ اسی طرح کسریٰ پر ابتدائی کاری ضرب انہیؓ کے ہاتھوں لگی اور انہیؓ کے ہاتھوں قیصر کی سلطنت میں سے شام کا ملک اسلامی قلمرو میں شامل ہوا اور آخرالذکر مصر کے فاتح ہوئے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان دو عظیم انسانوں کا قبول اسلام دراصل صلح حدیبیہ ہی کے ثمرات کا مظہر تھا۔

اس صلح حدیبیہ کے ثمرات و فوائد بہت سے ہیں، مختصراً یہ کہ درحقیقت یہ صلح حدیبیہ ہی فتح مکہ کی تمہید بنی۔ نبی اکرم ﷺ کو ۶ھ سے ۸ھ تک امن وسکون کے جو دو سال ملے اس میں توحید کی انقلابی دعوت نے نہایت سرعت کے ساتھ وسعت اختیار کی اور مسلمانوں کی ایک بڑی جمعیت فراہم ہو گئی۔

بیرون عرب دعوتی خطوط کی ترسیل

صلح حدیبیہ کے بعد رسول اللہ ﷺ نے پہلی مرتبہ جزیرہ نمائے عرب سے باہر بھی متعدد سلاطین کو اپنے دعوتی مکتوبات ارسال فرمائے۔ اس سے پہلے آپؐ نے بیرون عرب نہ کوئی نامہ مبارک لکھا اور نہ ہی کوئی ایلچی بھیجا۔ ۷ھ ہجری تک حضورؐ کی تمام دعوتی و تبلیغی سرگرمیاں جزیرہ نمائے عرب کے اندر اندر تھیں، لیکن صلح حدیبیہ کے بعد ۷ھ ہجری میں حضور ﷺ نے دعوتی سرگرمیاں عرب کی حدود سے باہر بھی شروع فرمائیں اور آپؐ نے مختلف صحابہؓ کو ایلچی بنا کر عرب کے اطراف و جوانب میں تمام سربراہانِ سلطنت کی جانب بھیجا اور انہیں اسلام لانے کی دعوت دی۔

صلح حدیبیہ کے بعد اب حضورؐ کی دعوتی سرگرمیاں دو شاخوں میں بٹ گئیں۔ ایک اندرون ملک عرب اور دوسری بیرون ملک عرب ـــــ آخرالذکر مرحلہ انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کا ساتواں مرحلہ ہے۔

ادائے عمرہ

اگلے سال ذیقعدہ ۷ھ میں نبی اکرم ﷺ نے عمرۂ قضا ادا فرمایا۔ آپؐ نے اعلان کرا دیا کہ جو اصحاب پچھلے سال حدیبیہ میں موجود تھے ان میں سے کوئی رہ نہ جائے، سب

کے سب چلیں۔ چنانچہ اس دوران جو لوگ فوت ہو گئے تھے ان کے سوا سب نے آپؐ کی پکار پر لبیک کہا اور عمرے کی سعادت حاصل کی۔ صلح حدیبیہ میں طے شدہ شرط کے مطابق نبی اکرم ﷺ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے جلو میں حالت احرام میں مکّہ تشریف لائے۔ حضورؐ اور صحابہ کرامؓ با آواز بلند تلبیہ کہتے ہوئے حرم شریف کی طرف بڑھے۔ حضرت عبداللہ بن رواحہ انصاری رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ کے اونٹ کی مہار پکڑے یہ رجز پڑھتے جاتے تھے۔ ان اشعار کو امام ترمذیؒ نے شمائل میں نقل کیا ہے :

خَلُّوا بنی الکفار عن سبیله
الیوم نضربکم علٰی تنزیله
ضربا یزیل الهام عن مقیله
ویذهل الخلیل عن خلیله

"کافرو، آج سامنے سے ہٹ جاؤ! آج تم نے اترنے سے روکا تو ہم تلوار کا وار کریں گے۔ وہ وار جو سر کو خوابگاہِ سر سے الگ کر دے اور دوست کے دل سے دوست کی یاد بھلا دے۔"

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا جم غفیر تھا اور وہ کعبہ شریف کی دید سے شاد کام ہو رہے تھے اور عمرہ ادا کرنے کی تمنا و آرزو کو پورے جوش و خروش اور چشم تر سے بجالا رہے تھے۔ شرط کے مطابق حضورؐ اور صحابہؓ تین دن تک مکّہ میں مقیم رہے۔ قریش کے تمام بڑے بڑے لوگ مکّہ سے نکل گئے کہ نہ ہم اہل ایمان کو دیکھیں نہ ہمارا خون کھولے اور نہ اس کے نتیجے میں کوئی تصادم اور حادثہ وقوع پذیر ہو۔ لہٰذا وہ سب کے سب پہاڑوں پر چڑھ گئے۔

قریش کی شکست خوردگی

حقیقی نہیں تو معنوی طور پر یہ قریش کی زبردست شکست تھی اور حضور ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے ادائے عمرہ سے ان کی ساکھ کو بڑا شدید نقصان پہنچا تھا۔ کیونکہ اُس وقت صورت حال یہ تھی کہ اگرچہ عرب میں کوئی باقاعدہ حکومت نہیں تھی لیکن پورے عرب کی سیاسی، مذہبی اور معاشی سیادت و قیادت قریش کے ہاتھ میں تھی۔ گویا باقاعدہ اور تسلیم شدہ نہ سہی لیکن بظاہر احوال درحقیقت (de facto) قریش کو پورے عرب پر ایک

نوع کی حکمرانی حاصل تھی۔ اگرچہ کوئی باضابطہ اعلان شدہ (Declared) حکومت نہیں تھی اور کوئی تحریری معاہدہ یا دستور و آئین موجود نہیں تھا۔ اس لئے کہ وہاں قبائلی نظام تھا' لیکن قدیم روایات موجود تھیں جس کے مطابق معاملہ چل رہا تھا۔ جیسا کہ آج تک برطانیہ کا کوئی تحریری دستور (Written Constitution) موجود نہیں ہے' بلکہ روایات کی بنیاد پر ان کا معاملہ چل رہا ہے' کم و بیش یہی معاملہ اہل عرب کا تھا' جس کی زو سے گویا قریش عرب کے حکمران تھے ـــــ کعبۃ اللہ کے باعث مذہبی سیادت ان کے پاس تھی۔ معاشی اعتبار سے نہایت خوشحال تھے۔ ان کے قافلوں پر کوئی حملہ نہیں کر سکتا تھا' اس لئے کہ ہر قبیلہ کا "خدا" بت کی شکل میں بطور یرغمالی قریش کے پاس رکھا ہوا تھا۔ چنانچہ قریش کو پورے عرب پر جو سیادت و قیادت حاصل تھی وہی اسلامی انقلاب کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ لہٰذا یہ وجہ تھی کہ ہجرت کے بعد نبی اکرم ﷺ نے سب سے زیادہ ان ہی کے خلاف اقدامات فرمائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ ربّ العالمین OO

کل پاکستان ختم نبوت کانفرنس

جامع مسجد ختم نبوت مسلم کالونی صدیق آباد (ربوہ) مورخہ ۱۶/۱۵' اکتوبر ۱۹۹۸ء بروز جمعرات' جمعہ ۱۷ویں سالانہ کل پاکستان ختم نبوت کانفرنس منعقد ہو رہی ہے جس میں تمام مکاتب فکر کے زعماء' دینی و سیاسی شخصیات' علمائے کرام' مشائخ عظام خطاب فرمائیں گے۔ اسلامیان پاکستان سے اپیل ہے کہ بھرپور شرکت کر کے کانفرنس کو کامیاب بنائیں

الداعیان	دفتر استقبالیہ
(حضرت مولانا خواجہ) خان محمد' امیر مرکزیہ	جامع مسجد و مدرسہ ختم نبوت مسلم کالونی صدیق آباد
(حضرت مولانا) محمد یوسف لدھیانوی' نائب امیر	(ربوہ) فون : 04524-212611

عالمی مجلس تحفظ نبوت' صدر دفتر حضوری باغ ملتان روڈ پاکستان' فون : 514122

ایران میں پارلیمانی انقلاب (۲)

آئین سازی اور پارلیمانی جمہوریت کا آغاز

بسلسلہ علامہ اقبال اور مسلمانانِ عجم (۱۲)

ڈاکٹر ابو معاذ

ایران کی پہلی اسلامی حکومت' مرزا کوچک

مرزا کوچک صوبہ گیلان کے دارالحکومت رشت کے ایک غریب خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ کا نام مرزا یونس تھا۔ آپ نے رشت کے سکول میں ابتدائی تعلیم کے بعد تہران کے دینی مدرسہ میں داخلہ لیا۔ علمی موشگافیوں سے اکتا کر آپ جلد ہی تعلیم ادھوری چھوڑ کر میدان عمل میں اتر آئے۔ تہران میں قیام کے دوران آپ خفیہ تنظیم "اتحاد اسلامی" کے رکن بن گئے جسے سید جمال الدین افغانی نے اپنے استنبول کے قیام کے دوران تشکیل دیا تھا۔ تہران سے تن تنہا واپس وطن لوٹنے کے بعد آپ اپنے چار دوسرے انقلابی نوجوانوں کے ساتھ مل کر سرکاری فوج پر حملے کرنے لگے۔ پھر ان کے ساتھ مزید لوگ بھی ملتے گئے' یہ لوگ مزید گوریلا کارروائیوں کے لئے گیلان کے گھنے جنگل میں چلے گئے۔ ان لوگوں کے سر اور داڑھی کے بال بہت لمبے ہوتے تھے' کیونکہ انہوں نے قرآن پر حلف اٹھایا تھا کہ ایران کو روس اور برطانیہ سے آزاد کرائے بغیر یہ لوگ اپنے بال نہیں کٹوائیں گے۔ اس طرح اپنی چال ڈھال سے یہ لوگ طالبان سے ملتے جلتے تھے۔

مرزا کوچک خان نماز روزے کے پابند تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ انسان کا ہر عمل خدا کی رضا کے مطابق ہونا چاہئے۔ آپ نے عوام کو عصر حاضر کے فرعونوں کے سامنے

پیغمبروں کے راستہ پر چلنے کی تلقین کی تھی۔ گیلان کے جنگلات میں بغاوت کے دوران شاہ کے روسی کمانڈر نے آپ کو تہران سے خط لکھا کہ اگر وہ اپنے ہتھیار ڈال دیں تو انہیں ایک محفوظ' خوشحال اور مرفہ حال زندگی گزارنے کی ضمانت دی جاسکتی ہے۔ اس خط میں روسی افسر نے قرآن پاک کے حوالوں سے گمراہ کن استدلال کرتے ہوئے لکھا تھا کہ آپ جیسے راستباز اور درویش منش انسان کی بغاوت کے باعث غریب عوام زبردست پریشانی کا شکار ہیں' اس لئے کہ اس طرح کے تخریب کارانہ اقدامات آپ جیسے مرد کامل کو زیب نہیں دیتے۔ آپ نے جوابی خط میں لکھا کہ الفاظ کی شیرینی دراصل حق کو باطل کے دھندلکوں میں گم کرنے کے کام لائی جاتی ہے اور آپ صرف قابل نفرت بادشاہ کی خوشنودی کے حصول کے لئے مجھے میرے عظیم مقصد سے ہٹانا چاہتے ہیں۔ مجھے برطانوی اہلکاروں نے تو ایران کی حکومت کی پیشکش بھی کر رکھی ہے بشرطیکہ میں ان کا آلۂ کاربن جاؤں۔ میں نے انہیں اس لئے دھتکار دیا ہے کہ میں ایک عظیم مقصد کے حصول کے لئے کوشاں ہوں۔ یہ اسلام کا ابدی اصول ہے کہ جب کافر مسلمانوں کے مقدس وطن پر قابض ہو جائیں تو وہ جہاد کے لئے اٹھ کھڑے ہوں۔ انگریز اسلام اور انصاف کے ابدی تصور سے بے بہرہ ہیں' وہ تو صرف کمزور قوموں کو ہڑپ کرنا جانتے ہیں تاکہ انہیں غلامی کی زنجیروں میں جکڑا جاسکے۔ مرزا کوچک نے (روسی انقلاب سے قبل) اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ وہ ظلم و استبداد میں پسے ہوئے عوام کی دادرسی اور آزادی چاہتے ہیں۔ انہوں نے لکھا کہ وہ میرا جواب تمہیں بھی وہی ہے جو موسیٰ علیہ السلام کا فرعون کو اور رسول اللہ ﷺ کا ابوجہل کو تھا"۔

مرزا کوچک ایک منکسرالمزاج اور سادہ طبیعت کے انسان تھے۔ ان کی تقریر سادہ ہوتی تھی اور ان کا مقصد غیر ملکی غلبہ سے آزادی' ناانصافی کا خاتمہ' ہر ایک کیلئے تحفظ اور انصاف کا آسان حصول اور آمریت اور شخصی استبداد کے خلاف مسلح جدوجہد کرنا تھا۔

ان دنوں شمالی ایران میں کئی بڑے جاگیرداروں نے روسی شہریت لے رکھی تھی اور وہ زارِ روس کی وفاداری کا دم بھرتے تھے۔ مرزا کوچک کا پہلا نشانہ ان لوگوں کی جائیداد تھی۔ آپ کے ہر ایکشن سے عوام کو آزادی نصیب ہوئی اور آپ کی تحریک کو مجاہدین

اور اسلحہ کی کھیپ ملتی رہی۔ ۱۹۱۸ء میں یہ تحریک گیلان کے صوبے میں مکمل کامیابی سے ہمکنار ہو چکی تھی اور اب مازندران اور بحیرۂ خزر (Caspean Sea) کے اردگرد کے دوسرے صوبوں تک پھیل رہی تھی۔ یہاں کی حکومت "اتحادِ اسلامی" کی ایک کمیٹی کے سپرد تھی جس کا سرکاری اخبار "جنگل" کے نام سے شائع ہوتا تھا۔

زیرِ انتظام علاقے میں فوجی تربیت کے کیمپ قائم تھے جہاں پر دیہاتی نوجوانوں کو جنگی تربیت دی جاتی تھی۔ جونہی ۱۹۱۷ء میں روس میں کمونسٹ انقلاب برپا ہوا اس تحریک کو ایران میں بہت استحکام نصیب ہوا کیونکہ زارِ روس کی حکومت کے خاتمہ کے باعث اب روس کی جانب سے انہیں وقتی طور پر کوئی خطرہ نہ رہا۔ روس کی نئی حکومت نے اپنے توسیعی عزائم جاری رکھے۔ ایک بار پھر ۱۹۲۰ء میں روسی دستے انزلی کی بندرگاہ پر اترنے لگے۔ ان کا کوئی واضح مقصد نہیں تھا۔ انہوں نے ابتداء میں ایک اس برطانوی اڈے کو نشانہ بنایا جو برطانوی فوجی عرصہ ہوا چھوڑ کے جا چکے تھے۔ تاہم روسیوں کی آمد کے موقع پر ایران سے بہت سے لوگ جو کمیونسٹ انقلاب سے متاثر تھے وہ انزلی میں جمع ہو گئے (جو گیلان کے صوبے میں واقع ہے)۔ ان لوگوں نے اجتماعی طور پر مرزا کوچک خان سے رابطہ قائم کیا کیونکہ آپ اب اس علاقے کے مسلمہ رہنما تھے۔ گزشتہ عہد کے برطانوی اور شاہی روس کے گٹھ جوڑ سے اپنی ازلی نفرت کے باعث مرزا کوچک نے انقلاب کے بعد کے روسیوں پر اعتماد کرتے ہوئے انزلی آنے کی دعوت قبول کرلی۔ آپ نے اعلان کیا کہ روسیوں سے ملنے میں آپ کا یہ مقصد ہے کہ وہ تمام دنیا اور انسانیت کے دشمن برطانیہ کو (جو روس کا بھی دشمن ہے) ایران سے نکال باہر کریں۔ روسیوں نے مرزا کوچک خان کے زیرِ انتظام علاقہ میں بالشویک جمہوری ریاستوں کی طرز پر ریاستیں بنانے کا مطالبہ کیا جو مرزا کوچک خان نے مسترد کر دیا۔ روسیوں نے پھر یہ تجویز پیش کی کہ مرزا کوچک خان ایرانی کمیونسٹوں کی پارٹی "عدالت پارٹی" کے اشتراک سے حکومت بنائیں۔ یہ تجویز اس لئے مسترد کر دی گئی کہ مرزا کوچک کے بقول ان لوگوں کو ایران کی روایات، بود و باش، اخلاقی اصولوں اور عوام کے عقائد و افکار کا کچھ علم نہیں ہے۔ مرزا کوچک اپنے مذہبی تصورات کو چھوڑنے پر تیار نہیں تھے۔

پھر مرزا کوچک سے روسیوں کا ایک معاہدہ طے پایا جس کے مطابق بالشویک طرز کا نظام گیلان اور دیگر علاقوں میں فی الحال قائم نہیں کیا جانا تھا' اپنے زیر انتظام علاقے میں ایک انقلابی حکومت کا قیام عمل میں تھا۔ تہران کی فتح کے بعد عوام کی منتخب پارلیمنٹ کا قیام عمل میں لایا جانا تھا جس کی قائم کردہ حکومت کے معاملات میں روس کسی قسم کی مداخلت کا مجاز نہیں تھا۔ اسی طرح کچھ اور شرائط بھی اس معاہدے میں شامل تھیں۔

جون ۱۹۲۰ء میں کوچک خان نے رشت اور انزلی کی بندرگاہ پر قبضہ کرلیا اور اپنے مرکز منجیل سے شمال میں منتقل ہو گئے۔ اس طرح آپ کی انقلابی حکومت گیلان قائم کر دی گئی جسے روسیوں کا تعاون حاصل تھا اور اس علاقہ میں لوگوں کی جان و مال اور جائیداد کا تحفظ اور اسلامی اصولوں کی پاسداری شامل تھی۔ اُس وقت کے تہران میں مقیم برطانوی سفیر کے مطابق مرزا کوچک خان اس قدر مضبوط ہو چکا تھا کہ اگر وہ ۱۹۲۰ء میں حالات کا صحیح ادراک کر کے تہران میں داخل ہو جاتا تو کوئی چیز اس کے مانع نہ ہوتی۔

اس وقت حکومت میں مرزا کوچک خان اور اس کے مذہبی اور قوم پرست ساتھیوں کے علاوہ بورژوا دانشوروں کے طبقے کے نمائندہ احسان اللہ خان اور ایک کمیونسٹ خالو قربان (جسے عسکریت پسند کردوں کی حمایت حاصل تھی) شامل تھے۔ آہستہ آہستہ ان لوگوں کی آپس میں پھوٹ پڑ گئی اور کمیونسٹوں نے مرزا کوچک کے خلاف بغاوت کر دی۔ مرزا ایک بار پھر جنگل میں روپوش ہو گئے۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد ان تمام لوگوں میں پھر تصفیہ ہو گیا اور مرزا کی قیادت تسلیم کر لی گئی۔ قصہ مختصر یہ کہ رضا خان نے جب گیلان کی جانب پیش قدمی کی تو مرزا جنگل میں چلے گئے اور پھر برفانی طوفان میں گھر کر فوت ہو گئے۔ ان کا سر کاٹ کر تہران لایا گیا' جہاں سے ان کے ایک فدائی نے ان کا سر دوبارہ وہاں سے نکال کر ان کے دھڑ کے ہمراہ گیلان میں سلیمان دارات کے مقام پر دفن کر دیا' جہاں ان کی قبر حریت اور آزادی کی نشانی کے طور پر موجود ہے۔

اپنی وفات کے چوالیس برس بعد ۱۹۶۵ء میں مرزا کوچک خان کے افکار ایک دفعہ پھر انقلابی نوجوانوں کے سامنے آنا شروع ہوئے۔ شہنشاہ ایران کے خلاف سرگرم عمل مجاہدین خلق نے جنگل کی تحریک کی طرز پر اپنے مشن کا آغاز کیا۔ انہوں نے اپنے پہلے زیر

زمین اخبار کا نام "جنگل" رکھا۔ ۱۹۷۹ء کے اسلامی انقلاب کے موقع پر مرزا کوچک کو قومی ہیرو کا درجہ دیا گیا اور ان کا ذکر روایتی مذہبی علماء نے بھی احترام سے کیا' جبکہ ان کے پیش رو مرزا کوچک خان کو کمیونسٹ قرار دے کر مطعون کرتے رہتے تھے۔ اس کا اظہار مرزا کوچک نے اپنی زندگی میں اس طرح کیا تھا :

"یہ امر افسوس ہے کہ ایرانی مُردہ لوگوں کا احترام تو کرتے ہیں مگر کبھی زندہ لوگوں کی جدوجہد کی اہمیت کو تسلیم نہیں کیا کرتے۔ ہمارے بعد ایک ایسی صبح طلوع ہوگی جس کے اُجالے میں یہ لوگ جان لیں گے کہ ہم کون لوگ تھے اور کن لوگوں کے حقوق کے لئے لڑ رہے تھے۔ آج ہمیں لوگ رہزن اور ڈاکو کہہ لیں لیکن کل یہ ضرور ثابت ہو جائے گا کہ ہمارا ایک ایک قدم لوگوں کی فلاح و بہبود کے لئے تھا۔ ہم تمام الزامات سنتے رہیں گے اور فیصلہ اللہ پر چھوڑ دیں گے۔" ؎

عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہلِ وطن
یہ الگ بات ہے دفنائیں گے اعزاز کے ساتھ

اور بقول عرفانی ؎

پس زمن آوای عشق پاکِ من
می دہد ای دوستان از خاکِ من
حرفِ عرفانی صدایٔ تو بود
ہوی و ہایش ہوی و ہایٔ تو بود

(اے میرے دوستو! میرے بعد میرے سچے عشق کا شور و غل اور ہنگامے میری خاک سے اُبھریں گے۔ میری صدا تیری صدا بن جائے گی اور میری آہ و زاری تیری آہ و زاری بن جائے گی۔)

یہاں ایک چیز بہت اہم ہے اور اس کا ذکر اس لئے ضروری بھی کہ برصغیر کے مسلمانوں کا جذبہ بھی ریکارڈ میں آجائے کہ کس طرح انہوں نے اپنی مجبوریوں اور سادگی کے باوجود ایران میں اسلامی انقلاب کی بنیاد رکھنے میں مدد دی۔ یہ اس طرح ہوا کہ مرزا کوچک خان کو کچلنے کے لئے انگریزی فوج بھی شمالی ایران بھیجی گئی' اس میں سادہ لوح

مسلمان فوجی بھی بڑی تعداد میں موجود تھے جن میں سے بیشتر کا تعلق پوٹھوہار سے تھا۔ یہ لوگ گیلان کے جنگلات میں فوجی کارروائی کر کے مرزا کوچک کے ساتھیوں کا صفایا کرنے کے لئے بھجوائے گئے تھے۔ مسلمان سپاہیوں نے مرزا کوچک کا لٹریچر پڑھ کر (اُن دنوں فارسی سمجھنا ہمارے نیم خواندہ لوگوں کے لئے بھی چنداں مشکل نہیں تھا) آپ کے مشن سے واقفیت حاصل کی۔ پھر اپنے مشاہدے اور تجربے سے یہ لوگ گوریلا جنگ لڑنے والے مسلمان انقلابیوں کی سرگرمیوں سے آگاہ ہوئے تو ان سے اس قدر متاثر ہوئے کہ فوج سے بھاگ کر مرزا کوچک خان کے دستوں سے جا ملے اور اپنے ایرانی بھائیوں کے شانہ بشانہ لڑنے لگے۔ ایک بڑی تعداد میں یہ لوگ جنگ لڑتے لڑتے شہید ہو گئے اور کافی تعداد میں اس چند روزہ اسلامی ریاست کے سقوط کے موقع پر گرفتار ہوئے۔ انہیں باندھ کر بغداد لایا گیا اور سب کے سب پھانسی چڑھ گئے "اللّٰھم اغفرلھم وارحمھم"

بنا کردند خوش رسمی بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند این عاشقان پاک طینت را

(خاک و خون میں لوٹ کر ان لوگوں نے کیسی اچھی رسم کی بنیاد رکھی۔ خدا ان نیک سیرت، مخلص اور جذباتی عاشقوں پر اپنی رحمت کا نزول فرمائے۔)

اس طرح انقلاب کی بنیاد میں اپنا خون شامل کرنے والوں میں کچھ ہمارے سرپھرے لوگ بھی تھے جن کو خراج عقیدت پیش کرنا ہمارا فرض بنتا ہے۔

پہلوی دور

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، قاچاریوں کے عہد میں ایران طوائف الملوکی کا شکار تھا اور بادشاہ کی حیثیت غیر ملکی طاقتوں کے ہاتھوں ایک کٹھ پتلی کی سی رہ گئی تھی۔ برطانوی اور روسی افواج ملک میں آزادی سے دندناتی پھر رہی تھیں۔ اس زمانے میں ایک مجہول سپاہی رضا خان کو اقتدار نصیب ہوا۔ یہ شخص شمالی صوبہ مازندارن میں ۱۹۷۸ء میں پیدا ہوا اور جب چودہ برس کی عمر میں فوج میں بھرتی ہوا تو بالکل اَن پڑھ تھا۔ فوج میں آنے کے بعد اس نے کچھ تعلیم حاصل کی اور آہستہ آہستہ ترقی کر کے کرنل کے عہدے پر فائز ہوا۔

اس نے چھوٹے چھوٹے خود مختار حکمرانوں کو شکست دیتے ہوئے ایک بار پھر ایران میں مرکزی اقتدار قائم کیا۔ تہران پر اپنے قبضہ کے بعد سید ضیاء الدین کو وزارت عظمیٰ سے ہٹایا اور قوام السلطنت کو وزارت عظمیٰ سونپ کر خود وزیر دفاع بن گیا۔ پھر فوج کی تنظیم نو کی اور اس کی تعداد ڈھائی ہزار سے بڑھا کر چالیس ہزار کر دی۔ آہستہ آہستہ مالیاتی اصلاحات پر توجہ دی اور ملس پاگ کی مدد سے ایران کا ایک متوازن بجٹ بنوایا۔

وہ اکتوبر ۱۹۲۳ء میں فوج کے سپہ سالار اور وزیر دفاع کے عہدوں کے ساتھ وزیر اعظم بھی بن گیا۔ کئی چھوٹی چھوٹی قبائلی افواج کو غیر مسلح کیا' خود مختار ریاستوں کا قلع قمع کیا' مرزا کوچک خان کی گیلان کی ریاست کو ختم کیا اور پھر خوزستان کی طرف توجہ دی اور وہاں عرب شیوخ کا اثر و رسوخ ختم کیا۔

اسی زمانے میں ترکی میں ری پبلک بنی اور مصطفیٰ کمال پاشا نے وہاں خلافت کا خاتمہ کر کے جمہوریت کی داغ بیل ڈالی۔ اس طرح ترکی کے تجربے سے متاثر ہو کر اس نے ایران میں بادشاہت کے خاتمے اور اسے جمہوریہ بنانے کا عہد کیا' مگر علماء نے اس مسئلہ پر اس کا ساتھ نہ دیا۔

ترکی میں خلافت کے خاتمہ سے علماء کو بہت دکھ پہنچا تھا اور وہاں پر جس طرح مذہبی اور قدیم روایات کی بیخ کنی کی گئی تھی اس سے ایرانی علماء بھی خائف تھے۔ رضا خان نے ایرانی عوام میں تحریک چلائی کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ملک سے بادشاہت کو ختم کر دیں اور انہیں قم میں جمع کیا مگر علماء نہ مانے۔ مجلس میں ان کے نمائندے موجود تھے اور آیت اللہ مدرس بہت بلند آہنگ پارلیمنٹرین تھے۔ اس لئے علماء کے اصرار پر رضا خان نے بادشاہت کو برقرار رکھنے کا مطالبہ منظور کر لیا۔ بعد کے واقعات میں علماء کا یہ قدم بہت حیرت و استعجاب کا باعث بنا ہے' مگر عموماً علماء (ماسوائے چند مواقع کے) پرانی روایات کا ساتھ دیتے رہے ہیں۔ ۱۴ دسمبر ۱۹۲۵ء کو احمد شاہ کی ملک سے عدم موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے رضا خان نے رضا شاہ پہلوی کے نام سے تاج و تخت پر قبضہ کرنے کے بعد اپنی آمرانہ حکومت کا آغاز کیا اور اتاترک کے طریق اپنانا شروع کر دیئے۔ اس موقع پر علامہ اقبال نے فرمایا ؎

نہ مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں ہے نمود اس کی
کہ روحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی

بادشاہت سنبھالنے کے بعد رضا شاہ نے روسیوں سے معاہدہ کیا اور انگریزوں سے معاہدہ منسوخ کر دیا۔ ہمسایہ اسلامی ممالک سے بھی علیحدہ علیحدہ دوستی کے معاہدے کئے۔

ملک میں تعلیم کے فروغ کے لئے آدھے ملکی وسائل وقف کر دیئے۔ جدید تعلیم کی علماء نے زبردست مخالفت کی مگر اسے وہ خاطر میں نہ لایا۔ ۱۹۳۵ء میں تہران میں یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ فارسی زبان کی ترویج و ترقی کے لئے کام کیا اور صنعت و حرفت کو فروغ دیا۔ ملک بھر میں ریلوے کا وسیع جال بچھایا اور تیل کے چشموں سے ہونے والی آمدنی میں اپنا زیادہ حصہ مانگا۔

عورتوں کے پردہ کرنے پر پابندی عائد کر دی گئی اور پولیس کو حکم دیا گیا کہ جہاں کوئی عورت چادر اوڑھے ہوئے نظر آئے اسے زبردستی نوچ لیا جائے۔

جدید تعلیم اور پردے کے خاتمے کے علاوہ رضا شاہ نے کئی ایسے اقدام کئے جن کے نتیجہ میں ایران مغربیت کی جانب مائل ہوا۔ اس وجہ سے علماء نے سخت احتجاج کیا۔ تمام لوگوں کے لئے رضا شاہ نے یورپین لباس لازمی قرار دیا اور پگڑی پہننے پر پابندی لگا دی۔ اب عمامہ صرف لائسنس پانے والے لوگ ہی پہن سکتے تھے۔ علماء نے جب سخت احتجاج کیا تو ان کے وظائف بند کر دیئے گئے اور مقامات مقدسہ سرکاری تحویل میں لے لئے گئے۔ پھر علماء کی آواز کو دبا دیا گیا۔

اسی دوران دوسری جنگ عظیم شروع ہو گئی، جس کے نتیجے میں ایران پر اتحادی قابض ہو گئے۔ رضا شاہ کو اپنے اٹھارہ سالہ بیٹے محمد رضا شاہ کے حق میں حکومت سے دستبردار ہونے کو کہا گیا اور اسے ۱۹۴۱ء میں جنوبی افریقہ کے شہر جوہنسبرگ میں جلاوطن کر دیا گیا، جہاں وہ ۱۹۴۴ء میں فوت ہو گیا۔ بعد میں اس کے تابوت کو نکال کر تہران کے نواح میں شہر رے میں دفن کیا گیا۔ اسلامی انقلاب سے پہلے وہاں سے تابوت نکلوا کر قاہرہ بھجوا دیا گیا جہاں اسے دفن کیا گیا۔

محمد رضا شاہ پہلوی (۱۹۴۱ـ۱۹۷۹ء)

یہ اپنے باپ کی معزولی پر برسر اقتدار آیا۔ دوسری جنگ عظیم کے خاتمہ پر اسے صحیح اقتدار ملا تو اس نے کل پرزے نکالے۔ یہ وہی دور تھا جب مختلف ممالک میں آزادی کی تحریکیں کامیابی سے ہمکنار ہو رہی تھیں۔ چین اور انڈونیشیا کی آزادی کے علاوہ برصغیر کی آزادی کے بعد دو اہم ملک ہندوستان اور پاکستان دنیا کے نقشے پر اُبھرے تھے۔ ایران پہلا ملک تھا جس نے پاکستان کو تسلیم کیا۔ اس بادشاہ کے زمانہ میں مصدق کے انقلاب (جس کا آگے مفصل ذکر کریں گے) کا واقعہ پیش آیا۔ پھر تیل کی دولت سے مالا مال ہونے کے بعد ملک میں لوٹ کھسوٹ شروع ہوئی۔ عوام کی آواز کو کچلنے کے لئے جبر و استبداد کا ہر حربہ آزمایا گیا اور ساواک جیسی خوفناک خفیہ سرکاری تنظیم قائم کی گئی۔ آمرانہ شخصی اقتدار کا دَور دورہ شروع ہوا۔ امریکیوں کو خصوصی حقوق دیئے گئے اور انہیں ایرانی قوانین کے اطلاق سے مستثنیٰ قرار دیا گیا۔ امریکہ سے دفاعی معاہدے ہوئے اور ایران کی مضبوط مسلح افواج وجود میں آئیں۔

ہر چند کہ تعلیم کے فروغ اور نئی سڑکیں بنانے پر توجہ دی گئی لیکن دیہات اور قصبات کے عوام جہالت کی پستیوں میں پڑے رہے۔ شراب نوشی کھلے عام ہونے لگی۔ فحاشی، عریانی اور مغربی بے پردگی کا سیلاب آگیا۔ ایران کو ایک مغربی اور سیکولر ملک کی صورت میں پیش کرنے کی ہر ممکنہ کوشش کی گئی۔ پریس کی آزادی چھین لی گئی۔ اظہارِ رائے کرنے والے حضرات کو قابل گردن زدنی قرار دیا گیا۔ خوشامد اور قصیدہ گوئی کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ فارسی سے عربی الفاظ باہر نکالنے کے لئے "فرہنگستان" کا ادارہ قائم کیا گیا۔ عوام کے پیسے کو رنگا رنگ تقاریب میں بہایا گیا۔ اسلامی عظمت پر فخر کرنے کی بجائے ڈھائی ہزار سالہ ایرانی بادشاہت کی یاد میں جشن منا کر اپنا ناطہ قبل از اسلام کی زرتشتی تہذیب سے جوڑنے کی کوششیں ہوئیں۔ مذہبی علماء کی زبان بند کر دی گئی یا وہ جلا وطن کر دیئے گئے۔

ان حالات کے پیش نظر علماء، روشن فکر دانشوروں اور عوام الناس میں بے چینی

اور بے زاری کی لہر دوڑ گئی۔ پھر نوجوانوں نے مجاہدین خلق اور فدائین خلق کے نام سے اپنی اپنی تنظیمیں بنا کر گوریلا کارروائیاں شروع کر دیں۔ ان کو کچلنے کے لئے جبر و استبداد کا ہر حربہ آزمایا گیا۔

اس صورت حال میں انقلاب اسلامی کی راہ ہموار ہوئی۔ اگست ۱۹۵۳ء میں ڈاکٹر مصدق نے بادشاہت کا خاتمہ کرنے میں وقتی طور پر کامیابی حاصل کر لی، مگر اس وقت شاہ مغربی استعمار (امریکہ) فوج اور علماء کی مدد سے واپس آ کر اپنے اقتدار پر متمکن ہو گیا۔ ۱۹۶۳ء میں سفید انقلاب کے نام پر جو اصلاحات لانا چاہیں وہ علماء کے لئے ناقابل قبول تھیں۔ آیت اللہ روح اللہ خمینی کی آواز پر ملک میں ہلچل مچی تو انہیں جلاوطن کر دیا گیا۔

جمال الدین افغانی کے افکار اور علامہ اقبال کے نظریات کو فروغ حاصل ہوا اور یہ انقلاب کی آواز بن گئے۔ ڈاکٹر علی شریعتی نے اسلام کی وضاحت سرگرم اور متحرک انداز میں کی۔ انہیں روایات کے مطابق ۱۹۷۷ء میں لندن میں زہر دلوا کے مروا دیا گیا۔ آیت اللہ طالقانی جیسے عظیم مذہبی رہنما نے انتہائی خطرناک حالات میں قوم کی بے لوث قیادت کی اور امام خمینی کی ملک سے طویل جلاوطنی کے دوران فکری اور عملی قیادت کی کمی محسوس نہ ہونے دی ـــــ اور پھر اسلامی انقلاب آ گیا۔ اس کا ذکر آئندہ صفحات میں موجود ہے۔

ڈاکٹر محمد مصدق کے جرأت مندانہ اقدام

ڈاکٹر مصدق ایک آزاد اور خود مختار ایران کے حامی تھے۔ بطور وزیر اعظم ان کی یہ دلی خواہش تھی کہ بڑی طاقتوں سے ٹکر لئے بغیر ایران کے مفادات کا تحفظ کیا جائے۔ مصدق سمجھتے تھے کہ ایران کے کسی ایک طاقت کی جانب جھکاؤ سے اس طاقت کا ملکی معاملات پر اثر ہونا لازمی امر ہے، کیونکہ بالآخر ملک کے سیاستدان دانستہ یا نادانستہ اس طاقت کے آلۂ کار بن جاتے ہیں۔ دراصل وہ مرزا کوچک خان کے الفاظ ہی دہرا رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ ایرانی معاشرے سے ان تمام آلودگیوں کا خاتمہ ضروری ہے جو وہاں کی سیاست، معیشت، سماجی اور ثقافتی معاملات میں ابھی تک موجود تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ میں

ایک ایرانی ہوں اور مسلمان ہوں اور جب بھی ایران اور اسلام کو خطرہ ہو گا تو میں اس کا ڈٹ کر مقابلہ کروں گا۔

مصدق کو نیشنل فرنٹ کی حمایت حاصل تھی جس میں مختلف طبقات کی نمائندگی موجود تھی۔ اس میں آیت اللہ کاشانی بھی شامل تھے جو روایتی مذہبی رہنما تھے اور وہ فدائین اسلام کی قیادت کر رہے تھے جس کا مقصد روایتی اسلامی نظریات کے خلاف کسی بھی تحریک کا مقابلہ کرنا تھا۔ یہ لوگ برطانوی اور روسی سامراجیت کے مخالف تھے' مگر امریکہ کی روس دشمنی کے باعث سرد جنگ کے اس ابتدائی دور میں ان کا اس وقت فطری طور پر امریکہ کی جانب جھکاؤ تھا۔ ان دنوں برطانیہ کا عملی اور انتظامی کنٹرول ایران کے اس وسیع و عریض ڈھائی لاکھ مربع کلو میٹر علاقہ پر تھا جو تیل کی دولت سے مالا مال تھا اور صرف ابادان کی ریفائنری برطانیہ کے لئے سالانہ پچیس ملین ٹن صاف تیل مہیا کرتی تھی۔ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۵۰ء تک کے عرصہ میں برطانیہ نے ۳۲۴ ملین ٹن ایرانی تیل برآمد کرنے کے عوض ایران کو صرف ۴۲۰ ملین ڈالر کی معمولی رقم ادا کی تھی جو تمام آمدنی کا صرف آٹھ فیصد (۸%) تھی۔ جبکہ اس دوران بحرین' سعودی عرب اور عراق کی حکومتیں تیل کی آمدنی کا بالترتیب ۳۵ فیصد' ۵۶ فیصد اور ۶۰ فیصد وصول کر رہی تھیں۔

عوام کی جانب سے جب ایرانی تیل کے قومیائے جانے کی تحریک نے زور پکڑا تو مصدق ایک قومی ہیرو کی حیثیت اختیار کر گیا۔ برطانیہ نے اپنے استعماری مفادات کے تحفظ کے لئے اپنی بحریہ کو ابادان کے قریب تعینات کر کے ایران کو انتہائی نتائج کی دھمکی دے دی۔ مئی ۱۹۵۱ء میں مصدق نے ایک کمیٹی تشکیل دی جس میں مہدی بازرگان بھی شامل تھے (جو انقلاب اسلامی کے بعد پہلے وزیر اعظم بنے)۔ اس کمیٹی کے ذمہ تیل کو قومیانے کے عمل کے لئے تفاصیل کی تیاری تھی۔ اس کمیٹی نے ایران کی قومی تیل کمیٹی تشکیل دی جس نے برطانوی کمپنی سے کنٹرول سنبھالنا تھا۔ برطانیہ اس کے لئے تیار نہ ہو سکا اور امریکی صدر ٹرومین نے بھی مصدق کو دوبارہ مذاکرات کے لئے کہا۔ مصدق کے اقدامات نے تیل پیدا کرنے والے دیگر ممالک میں بھی بے چینی کی لہر پیدا کر دی۔ اسی کشمکش کے نتیجہ میں مصر کے شاہ فاروق کا تختہ الٹا گیا اور جمال عبدالناصر نے نہر سویز پر قبضہ

کرلیا۔

علماء نے مصدق کے اقدامات کو کمیونسٹ اثرات کے زیر اثر ہونے کا الزام دیتے ہوئے اس پر طرح طرح کے الزامات لگانا شروع کردیئے۔ اس دوران شیعہ دنیا کے عظیم ترین رہنما حضرت آیت اللہ العظمیٰ بروجردی نے شاہ پرست اراکین مجلس کے ہمراہ پہلوی بادشاہت کے حق میں مدرسہ فیضیہ قم سے ایک جلوس نکالا' جس میں مصدق کی کھلم کھلا مذمت کی گئی۔ حتیٰ کہ علماء کے زبردست دباؤ کے نتیجہ میں آیت اللہ کاشانی بھی مصدق کی حمایت سے دستبردار ہو گئے اور انہوں نے ایک ایسی اسلامی کانفرنس کے انعقاد کا بے وقت مطالبہ کردیا جو منشیات کے پھیلاؤ' بدعنوانی اور قحبہ گری کے مسائل کا جائزہ لے جو مسلمان نوجوانوں کو درپیش ہیں۔ اس کا مقصد عوام کی توجہ اس مسئلہ سے ہٹا کر دیگر معاملات کی جانب مبذول کرنا تھا۔

تیل کے مسئلہ سے توجہ ہٹانے کے لئے اب آیت اللہ کاشانی نے حکم دیا کہ ان مغرب زدہ خواتین کے چہروں پر تیزاب پھینکا جائے جو پردے کے بغیر گھر سے نکلتی ہوئی پائی جائیں۔ علماء نے نعرہ لگایا کہ اسلام خطرے میں ہے اور مصدق کا اقتدار ایک کمیونسٹ اقتدار ہے۔ کمیونسٹ پارٹی کو بدنام کرنے کے لئے کئی دوسری چالیں چلی گئیں۔ آیت اللہ محمود طالقانی کے بقول رات بھر طلبہ اور علماء کمیونسٹ پارٹی کی جانب سے آیت اللہ بہبہانی کے گھر بیٹھ کر علماء کو جعلی خطوط لکھتے رہے۔ یہ خط سرخ سیاہی سے لکھے گئے۔ اور ہزاروں علماء کو ارسال کئے گئے انہیں لکھا گیا کہ بہت جلد ہم تمہاری پگڑیوں کی مدد سے تمہیں ذلیل و رسوا کر کے پھانسی دینے والے ہیں۔ مزید برآں کرائے کے لوگوں سے تہران کی سڑکوں پر اسلام کے خلاف نعرے بھی لگوائے گئے۔

اس کے نتیجہ میں آیت اللہ العظمیٰ بروجردی نے شاہ کو روم میں ایک تار بھیجی جس میں کہا گیا کہ شیعیت اور اسلام کو آپ کی ذات کی اشد ضرورت ہے اور آپ جلاوطنی ترک کر کے واپس تشریف لے آئیں۔ یہ بھی لکھا گیا کہ کیونکہ آپ شیعیت سے وابستہ ہیں اور آپ کے سفر شیعوں اور شیعیت کے تحفظ کے لئے ہیں اس لئے آپ ہوائی سفر سے اجتناب فرمایا کریں۔

(باقی صفحہ ۷۶ پر)

امریکی معاشرے کی موجودہ سیاسی اور اخلاقی حالت
پر سابق امریکی صدر

رچرڈ نکسن کا نوحہ

از قلم : چوہدری مظفر حسین ☆

دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکہ کو جو صدور میسر آئے ان میں رچرڈ نکسن منفرد اور امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک لحاظ سے وہ امریکہ کا ایک بدقسمت صدر تھا کہ واٹر گیٹ سکینڈل کی بدنامی اس کی قسمت میں لکھی تھی، پھر بھی وہ امریکہ کا کوئی عام صدر نہیں تھا بلکہ ایک مفکر، مدبر اور اعلیٰ پایہ کا مصنف ہونے کے اعتبار سے ایک غیر معمولی شخصیت کا مالک تھا، لیکن اس کی یہ ساری خوبیاں واٹرگیٹ سکینڈل کی وجہ سے گہنا گئیں۔ اس کا شمار امریکہ کے عظیم ترین صدور یعنی واشنگٹن، جیفرسن فرینکلن اور لنکن کی صف میں اس لئے بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ لوگ امریکی جمہوریت کے معمار تھے جبکہ نکسن ان کی تعمیر کردہ جمہوریت کی عمارت کو کھنڈروں میں تبدیل ہوتے دیکھ رہا تھا لیکن مروجہ جمہوریت کے ہاتھوں اتنا بے بس تھا کہ اپنے ملک میں جمہوری تہذیب کی گرتی ہوئی عمارت کو سہارا نہیں دے سکتا تھا۔

رچرڈ نکسن نے دس کتابیں لکھیں۔ اس کی آخری کتاب "ورائے امن" (Beyond Peace) ۱۹۹۴ء میں شائع ہوئی، جس کے بارے میں اس نے خود کہہ دیا تھا کہ "غالباً یہ اس کی آخری کتاب ہے"۔ اس کی پہلی تمام کتابیں عالمی سیاست اور امریکہ کی خارجہ پالیسی کے موضوعات سے متعلق تھیں مگر یہ کتاب وسیع تر حلقۂ قارئین

☆ اکیڈمک اینڈ ایڈمنسٹریٹو ڈائریکٹر آل پاکستان ایجوکیشن کانگریس

کیلئے لکھی گئی ہے۔ دیکھا جائے تو ایک طرح سے یہ کتاب نکسن کا اپنی قوم کے نام ایک "وصیت نامہ" ہے۔ کتاب کا آخری باب بالخصوص ان قومی عوارض سے بحث کرتا ہے جن میں امریکہ کا جمہوری معاشرہ آج کل مبتلا ہے' بلکہ اسے "جمہوری تہذیب کا نوحہ" کے نام سے بھی موسوم کیا جا سکتا ہے۔ اس باب میں نکسن نے جو خیالات پیش کئے ہیں وہ دنیا کے ان تمام لوگوں کے لئے سامان عبرت ہیں جو امریکہ کو نمونہ ترقی و کمال خیال کرتے ہیں۔ نیز یہ خیالات اس اعتبار سے بھی بے حد اہمیت کے حامل ہیں کہ یہ ایک ایسے شخص کے خیالات ہیں جس نے ایک عالمی طاقت کے بااختیار حکمران کی حیثیت سے پوری دنیا کو اس کی بلند ترین چوٹی سے دیکھا ہے اور ایک مقتدر سیاستدان کی حیثیت سے دنیا کے معاملات میں عملاً حصہ لیا ہے۔ اس لئے یہ خیالات اس قابل ہیں کہ ان پر توجہ دی جائے۔

"ورائے امن" کے تیسرے اور آخری باب میں نکسن نے اپنے ملک کے مختلف اداروں مثلاً حکومت' انتظامیہ' امن عامہ' تعلیم' ثقافت' سماجی فلاح و بہبود' عدل و انصاف' ذرائع ابلاغ اور خاندان میں سے ایک ایک کو لیا ہے اور دقت نظر سے ان کا جائزہ لینے کے بعد ان میں پائی جانے والی خرابیوں کا ذکر کیا ہے جو امریکی معاشرہ کو اندر ہی اندر دیمک کی طرح چاٹ رہی ہیں۔ وہ کہتا ہے :

> "ہمارے شہروں کو گھن لگا ہوا ہے اور اس کی سڑاند ہمارے روحانی' اخلاقی اور تہذیبی عادات و اطوار میں رچ بس گئی ہے جس سے غربت' جرائم اور عوامی سہولتوں کے ناجائز استعمال جیسے عوارض نے جنم لیا ہے"۔ (۱)

اس ضمن میں وہ پیٹ موئنی ہن (Pat Moynihan) کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتا ہے :

> "پچاس برس پہلے ہم ایک ایسے شہر کے باسی تھے جس کا ایک معاشرتی ڈھانچہ تھا' یہ اپنا ایک انفراسٹرکچر (یعنی ذیلی سہولتوں کا نظام) اور دنیا کا بہترین زمین دوز نظام مواصلات رکھتا تھا۔ عمدہ ترین رہائش گاہیں' شہری سکولوں کا بہترین نظام اور بہترین سلیقہ شعار شہری تھے۔ لیکن اب اسی شہر کے کئی حصے ایسی معاشرتی افراتفری کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں جو ظاہر کرتی ہے کہ ہم اپنے نوجوانوں کو معاشرہ کے اچھے شہری بنانے میں ناکام رہے ہیں۔ اور صورت حال سال بہ سال بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے"۔ (۲)

پیٹ موئنی ہن اپنی بات کی تائید میں سٹیٹ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس ایڈون ٹورس کے خط کا' جو اس نے اسے لکھا تھا' حوالہ دیتے ہوئے اس کا اقتباس پیش کرتا ہے۔ اس اقتباس میں ٹورس لکھتا ہے :

"زمین دوز ٹرینوں' کاروں' پنساری کی دکانوں' خوردہ فروش اسٹوروں' خود کار لانڈریوں' کیش مشینوں اور عمارتی لفٹوں میں ہر کہیں لوگ عام قتل ہو رہے ہیں لیکن لوگوں کی بے حسی اور خواب غفلت انہیں ایسے جنگ آزما فوجی کی سطح پر لے آئے ہیں جو ایک عرصے کی جنگ کے دوران دشمنوں اور اپنوں کی لاشوں پر بیٹھ کر بڑے اطمینان کے ساتھ جنگی راشن تناول کرتا ہے۔ جس معاشرے میں ظلم اور جور و ستم کا احساس باقی نہیں رہتا' نیستی اس کا مقدر بن جاتی ہے"۔ (۳)

تعلیمی انحطاط کا ذکر کرتے ہوئے نکسن لکھتا ہے :

"بعض لوگوں کا یہ خیال کہ سکول اس لئے ناکام ہو رہے ہیں کہ ہم ان پر بہت کم خرچ کرتے ہیں' ایک انتہائی لغو اور مہمل مفروضہ ہے۔ ۱۹۹۰ء میں امریکہ میں فی طالب علم اوسطاً پانچ ہزار دو سو سنتالیس ڈالر خرچ کئے گئے اور یہ رقم ۱۹۶۰ء کے مقابلے میں ڈھائی گنا زیادہ تھی اور دنیا کے صنعتی ترقی یافتہ جمہوری ممالک کے مقابلے میں تعلیم کی مد میں سب سے زیادہ رقم خرچ ہوئی۔ لیکن اس کے باوجود پچھلی تین دہائیوں میں علمی رجحانات کے ٹیسٹ (Scholastic Aptitude Test) کے سکور میں اسی فیصد (۸۰%) کمی واقع ہوئی اور کئی ایک جائزوں کے بعد یہ حقیقت آشکار ہوئی ہے کہ ریاضی اور سائنس جیسے اہم مضامین میں امریکی طلبہ دنیا کے دیگر ممالک سے پیچھے رہ گئے"۔ (۴)

اس انحطاط کی بنیادی وجہ اس کے نزدیک یہ ہے کہ سکول تعلیم و تربیت کے مراکز کے بجائے اسلحہ کے آزادانہ استعمال کے گڑھ بن چکے ہیں' جس کا سبب یہ ہے کہ ان میں ڈسپلن نہیں رہا اور طلبہ کو نظم و ضبط کا خوگر نہیں بنایا جاتا۔ چنانچہ وہ بڑی دلسوزی کے ساتھ ناصحانہ انداز میں کہتا ہے :

"امریکہ کے پبلک سکولوں کو اگر کوئی کام کر کے دکھانا ہے تو انہیں پھر سے تحصیلِ

علم کے مہذب مامن بنتا ہو گا' بجائے اس کے کہ وہ اسلحہ کے آزادانہ استعمال کے علاقے شمار ہوں۔ اولین بنیادی چیز کلاس روم میں نظم و ضبط کا پایا جانا ہے اور اس کے بعد ذاتی' معاشرتی اور ذہنی نظم کے اوصاف تحصیل علم کے لئے کلیدی عناصر کا کام دیتے ہیں۔ لیکن اس معیار پر پرکھا جائے تو ہمارے اکثر و بیشتر پبلک سکول کئی عشروں سے اساتذہ پر والدین کے اعتماد کو ٹھیس پہنچا رہے ہیں اور بتدریج انبوہ گردی (Mob Rule) کے سامنے سپر انداز ہوتے جا رہے ہیں"۔ (۵)

یونیورسٹیوں میں تعلیم کا جو حال ہے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے :

"امریکہ میں دنیا کی چند بہترین یونیورسٹیاں پائی جاتی ہیں۔ اگر انہیں اپنی پوزیشن کو بحال رکھنا ہے تو انہیں اپنی کمزوریوں کی طرف توجہ دینی ہو گی۔ "پلورلزم" (یعنی مختلف اقوام پر مشتمل معاشروں اور متنوع عناصر کو یکجا رکھنے) کے نام پر ان درس گاہوں کے انتہا پسندوں کا مطالبہ ہے کہ داخلے کی پالیسی اہلیت کے بجائے نسلی نمائندگی کے اصول پر مبنی ہونی چاہئے۔ نصابِ تعلیم 'علمی اور عقلی معیارات کی معروضیت کی بجائے نسل اور جنس کی سیاست کی بنیاد پر تیار کیا جانا چاہئے' تقریر کے قواعد و ضوابط آزادانہ علمی مباحثوں کو فروغ دینے کے برعکس ایسے احساسات کو ترقی دینے والے ہوں جو مغربی روایات کے خلاف معاندانہ مزاج رکھتے ہوں۔ جیسا کہ ہوور انسٹی ٹیوٹ کے ڈاکٹر مارٹن نے کہا ہے کہ بائیں بازو کے لبرل خیالات رکھنے والے پروفیسروں کا تناسب بہت زیادہ بڑھ جانے کی وجہ سے یونیورسٹیوں میں یک طرفہ ذہن کی کار فرمائی ہے۔ ۱۹۶۰ء کے یہ انقلابی آجکل یونیورسٹیوں کے بیشتر شعبوں پر مسلط ہیں اور "سیاسی اصلاح" کی ایک ایسی تحریک کو قوت فراہم کر رہے ہیں جو صداقت کو سزا اور اہلیت کو عقوبت کا مستوجب قرار دیتی ہے اور کوٹا سسٹم پر شعبوں کو ترقی دیتی ہے۔ ان سب کے نتیجے میں پرلے درجے کی جہالت کیمپس کے اندر سرایت کر رہی ہے"۔ (۶)

نوجوان نسل میں منشیات کا روز افزوں استعمال اور ان کے انسداد میں خود ماہرین صحت کی پیدا کردہ رکاوٹ اور انسداد منشیات کے سلسلے میں حکومت کی ناکامی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے :

"حکومت کے حالیہ اقدامات سے اس الزام کو تقویت ملتی ہے کہ وہ منشیات کے خلاف جنگ میں ہتھیار ڈال رہی ہے۔ گزشتہ سال کے آخر میں سرجن جنرل جائسلین ایلڈرز (Joycelyn Elders) نے یہ اشتعال انگیز تجویز پیش کر کے ملک بھر میں آگ لگادی کہ منشیات کے استعمال کو قانونی طور پر جائز قرار دے دیا جائے۔ انتظامیہ کی طرف سے اس بیان پر تردید نہ آنے کی وجہ سے منشیات کی غیر قانونی فروخت اور استعمال کے خلاف حکومت کی ان بیس سالہ کوششوں کو سخت دھچکا لگا جو یکے بعد دیگرے آنے والی پانچ حکومتوں نے شروع کر رکھی تھیں"۔ (۷)

عوامی کلچر کے نام پر فحاشی کی اباحیت کے نظریہ کے فروغ میں عوامی تفریح کے ذرائع مثلاً سینما اور ٹیلی ویژن کے کردار اور حقیقت کی عکاسی کے نام پر ہر بُرائی کی تشہیر پر وہ بڑے دکھ کے ساتھ کہتا ہے :

"کم از کم غیر محفوظ ہمسائیگی میں رہنے والے بچوں کو گھروں میں تو محفوظ ہونا چاہئے تھا۔ لیکن اس کے برعکس ہو یہ رہا ہے کہ جب وہ ٹیلی ویژن دیکھ رہے ہوتے ہیں یا سٹیریو پر پروگرام سن رہے ہوتے ہیں تو بازاروں، گلیوں، محلوں اور سکولوں کے احاطوں میں ہونے والے تشدد اور مار دھاڑ کے مناظر کا سیل بے پناہ ان کے رہائشی کمروں میں آن داخل ہوتا ہے۔ کارٹونوں کے کردار ان کے اندر آگ بھڑکاتے ہیں اور شعر و ادب کے نام پر مسلح ڈاکوؤں اور پولیس افسروں کی فلمیں دکھا کر ان کے دلوں میں تشدد کی ستائش کا جذبہ ابھارا جاتا"۔ (۸)

"ہالی وڈ کے وڈیروں کا دعویٰ ہے کہ امریکہ بیمار ہے اور اس کی بیماری کا آئینہ دکھا کر وہ حقیقت کی عکاسی کر رہے ہیں۔ ان کی اقدار وہی ہیں جو عوام کی اقدار ہیں، چنانچہ تشدد اور جنس پر مبنی فلمیں دھڑا دھڑ بک رہی ہیں اور ہالی وڈ والوں کا کاروبار دولت کماتا ہے۔ لیکن شرافت اور شائستگی کی بنیادی اقدار کی ذمہ داری سے دست کش ہو کر ہالی وڈ نے ان اقدار کے زوال کو معاشرہ میں تیز تر کر دیا ہے اور وہ تشدد کا جشن منا کر گھروں اور معاشرتی بہبود کے اداروں کی ساری کوششوں کو غارت کر رہے ہیں جن کا مقصد تشدد کی اس لہر کے خلاف بند باندھنا ہے جو گلیوں اور محلوں کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے۔" (۹)

"جنسی بغاوت نے امریکہ کی خاندانی زندگی کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔ طلاقوں' حرام کاری کی کثرت' ناجائز بچوں کی پیدائش اور بن شوہر بچوں والی ماؤں کی شرح بہت بڑھ گئی ہے' جس کے نتیجے میں نچلے درجے کے شہریوں کا ایک مستقل طبقہ معرض وجود میں آگیا ہے۔ طبقہ امراء اور درمیانے درجہ کے طبقے میں منشیات کے استعمال کے فیشن میں حال ہی میں کچھ کمی رونما ہونے کی وجہ سے بھی اس طرح کا ایک نیا طبقہ ابھرا ہے۔ خود سرشاری میں غرق افراد' اباحیت پسندانہ طریق حیات' انتقام اور ظلم و ستم کے چلن' محنت کی لاحاصلی اور امریکی معاشرے کی اندرونی ناانصافی سے ایک ایسا کاؤنٹر کلچر فروغ پذیر ہے جس میں اہلیت کی ناقدری اور ذاتی جدوجہد کی بے توقیری کا زنگ امریکی معاشرے کو کھائے جا رہا ہے حالانکہ اوصاف حمیدہ ہی افراد کی ترقی اور اخلاقی اصول و ضوابط کے استحکام اور کامیابیوں کے حصول کا سب سے زیادہ یقینی ذریعہ ہیں"۔ (۱۰)

خاندان کا شیرازہ بکھرنے کی وجہ سے امریکہ میں جرائم میں بڑی تیزی سے اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ نکسن کے نزدیک اس کی وجہ غربت نہیں بلکہ خاندانی نظام کی بربادی ہے' وہ لکھتا ہے :

"معاشرے میں ہر سو پھیلے ہوئے مسائل سے نمٹنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس حقیقت کا سامنا کریں کہ شہروں کا وہ نچلا طبقہ جہاں خاندانی زندگی میں بدترین شکست و ریخت ہوئی ہے' گلی کوچوں میں متشددانہ جرائم اور منشیات نوشی کا اصل ذمہ دار ہے"۔ (۱۱)

"جرائم کا الزام غربت پر ڈال دینا ذہنی کھوکھلے پن اور اخلاقی فساد کی علامت ہے۔ جس زمانے میں' میں جوان ہوا وہ ملک گیر معاشی بدحالی کا بدترین دور تھا لیکن جرائم بہت ہی کم تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ اُن دنوں خاندان اور معاشرے تہذیبی معیاروں کو برقرار رکھے ہوئے تھے"۔ (۱۲)

"آتش زن' لٹیرے' ڈاکو اور فسادی اس لئے نہیں آگ لگاتے' لوٹتے اور ڈکیتی اور تشدد کرتے کہ وہ غریب ہیں' بلکہ اس لئے ایسا کرتے ہیں کہ وہ تہذیبی اعتبار سے گل سڑ گئے ہیں۔ آج کے بدکردار شکاری نوجوان نشانۂ ستم بننے والے اپنے

"شکار" کو انتہائی سرد مہری اور نفرت و حقارت سے جور و ستم کا نشانہ بناتے ہیں۔ وہ بھوک کے ہاتھوں مجبور ہو کر خوراک کے لئے یہ کام نہیں کرتے بلکہ جوتوں کے ایک جوڑے کے لئے (یعنی بغیر کسی مطلب و مقصد کے) قتل کرتے ہیں"۔ (۱۳)

نکسن کی یہ پختہ رائے ہے کہ حکومت کے رفاہ عامہ کے پروگراموں کا اکثر و بیشتر فائدہ بدکردار افراد کو پہنچتا ہے۔ اپنی اس رائے کا اظہار کرتے وقت نکسن جذباتی ہو جاتا ہے اور اس کا لب و لہجہ تلخ اور سخت ہو جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے :

"شہروں کے تنزل و ابتذال میں کسی چیز کو براہ راست اتنا دخل نہیں ہے جتنا کہ کرپٹ کرنے، غیر مستحکم کرنے اور انسانیت کی تحقیر و تذلیل کرنے والا رفاہ عامہ کا نظام ہے۔ تشدد اور جرائم پیشہ طبقے کے بدترین لوگ اسی نظام کے پیدا کردہ اور پروردہ ہیں۔ یہ نظام خاص طور پر کچی عمر کے غیر شادی شدہ نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے جو ناجائز بچے تو پیدا کر لیتے ہیں لیکن انہیں پالنے کی اہلیت رکھتے ہیں نہ وسائل۔ رفاہ عامہ کا کوئی بھی معقول اور ہوشمندانہ نظام ناجائز اور حرامی بچوں کی حوصلہ افزائی نہیں بلکہ حوصلہ شکنی کرے گا..... (اس قسم کے بچوں کی پرورش کے لئے) ایک غیر منکوحہ ماں کو (رفاہ عامہ کے نام پر) جو سہولتیں مہیا کی جاتی ہیں ان پر بیس ہزار ڈالر خرچ ہو جاتے ہیں..... (ان سہولتوں کی بنا پر) سیاہ فام خاندانوں میں شکست و ریخت کی وجہ سے جو آفت آنے والی ہے اس کے بارے میں موئنی ہن نے آج سے تیس برس پیشتر متنبہ کیا تو اس کی کھال اُدھیڑ دی گئی لیکن وہ بالکل درست تھا۔ اسی قسم کا ایک انتباہ سفید فام خاندانوں کی تباہی کے بارے میں وال سٹریٹ جرنل میں چارلس مرے نے شائع کیا تھا اور اس کی کتاب "قدموں تلے سرکتی زمین" (Losing Ground) اس موضوع پر سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس نے نوٹ کیا کہ ۱۹۹۱ء میں ریاستہائے متحدہ امریکہ میں پیدا ہونے والے بچوں کی کل تعداد کا تیس فیصد حرامی یعنی غیر منکوحہ ماؤں کے بچے تھے۔ اور سیاہ فام عورتوں میں یہ شرح اڑسٹھ فیصد تھی۔ شہروں کے انتہائی اندرونی حصوں میں یہ شرح اسی فیصد (۸۰%) سے بھی بڑھ گئی اور سفید فام عورتوں میں یہ شرح بائیس فیصد تک پہنچ گئی۔ ان غیر منکوحہ ماؤں میں

بیاسی فیصد عورتیں ہائی سکول یا اس سے کم درجے تک تعلیم یافتہ تھیں۔ سفید فام عورتیں، جو غربت کی سطح سے نیچے زندگی بسر کرتی ہیں، جو بچے جنتی ہیں ان میں سے نصف حرامی ہوتے ہیں"۔ (۱۴)

نکسن اپنے ملک کے نظام عدل و انصاف کی لغویت اور نامعقولیت کا رونا روتا ہے اور اس کی ایک مثال دیتے ہوئے بتاتا ہے کہ عدل و انصاف کے جمہوری قوانین کس طرح مجرموں کو تحفظ فراہم کرتے ہیں :

"۱۹۸۴ء کے موسم گرما میں نیویارک شہر کے ایک زمین دوز ریلوے سٹیشن پر دو لٹیروں نے ایک ستر سالہ بوڑھے کو زمین پر گرا کر بری طرح مارا پیٹا اور اس کا گلا دبا کر اس کی جیبیں خالی کر دیں۔ اس مظلوم شخص کی چیخ و پکار سن کر ٹرانزٹ پولیس کے دو افسر اس کی مدد کو دوڑے۔ لٹیرے پولیس افسروں کے رکنے کے احکام کو نظر انداز کرتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے۔ ان افسروں نے گولی چلا دی جس سے ایک لٹیرا، جو عادی مجرم تھا، لنگڑا ہو گیا۔ اس نے ٹرانزٹ اتھارٹی پر ہرجانے کا دعویٰ کر دیا۔ ریاست نیویارک کی عدالت نے حال ہی میں اس لنگڑا ہونے والے لٹیرے کو تنتالیس (۴۳) لاکھ ڈالر کی ادائیگی کا حکم صادر کیا ہے جس کا بار زمین دوز ٹرینوں کے ان مسافروں پر پڑے گا جو ان لٹیروں کا شکار ہونے سے ابھی تک بچے ہوئے ہیں۔ اور دوسری طرف ان لٹیروں کا نشانہ بننے والے مظلوم بوڑھے شخص نے اپنا چشمہ ٹوٹنے پر ہرجانے کا جو دعویٰ کیا تھا اسے عدالت نے مسترد کر دیا"۔ (۱۵)

نکسن اس بات پر بھی بہت دکھی ہے کہ ظالموں، مجرموں، لٹیروں اور دہشت گردوں کے لئے عوام میں رحم اور ہمدردی کے جذبات پیدا کرنے میں ابلاغ عامہ کے ذرائع کا کردار کس قدر افسوسناک اور دردناک ہے ـــــ وہ اس کی مثال دیتے ہوئے لکھتا ہے :

"ویت نام کی جنگ کے خلاف احتجاج کرنے والی کیتھرائن پاورز کے خلاف مقدمہ کے سلسلے میں میڈیا کا کردار بڑا حیران کن اور تمام حدود و قیود توڑنے والا تھا اور اس سے بیک وقت مجرم اور مظلوم کے لئے یکساں ہمدردی مترشح ہوتی تھی۔ سوال یہ تھا کہ آیا امریکہ کو اس جنگ میں ملوث ہونا چاہئے تھا یا نہیں۔ اس پر

دیانت دارانہ اختلاف رائے پایا جاتا تھا۔ لیکن جنگ کے خلاف مظاہرہ کرنے والوں کے حق میں ہماری سوچ اس حد تک تو نہیں جانی چاہئے تھی کہ تشدد کرنے والوں کو بھی معاف کر دیا جائے۔ کیتھرائن پاورز کوئی معصوم بچہ نہیں تھی جسے کسی باغ سے پھول توڑتے ہوئے پکڑا گیا ہو۔ اس خاتون کی رہائش گاہ سے تین رائفلیں، ایک کاربین، ایک پستول، ایک شاٹ گن اور بہت بڑی مقدار میں گولہ بارود برآمد ہوا۔ اس پر ایک نیشنل گارڈز آرمری پر آتشیں بم پھینکنے کا الزام تھا۔ وہ ایک بینک ڈکیتی میں شامل تھی جس میں پولیس کے ایک اہلکار کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا تھا جو نو بچوں کا باپ تھا۔ ان تمام تلخ حقائق کو ہضم کر کے مجرمہ کے بارے میں نرم احساسات کا اظہار ایک سنگ دلانہ رد عمل ہی قرار پاتا ہے"
(۱۶)

نکسن کو افسوس ہے کہ اس بارے میں نیوز ویک کا رد عمل بھی لبرل میڈیا کی اکثریت کے عین مطابق تھا، جس نے لکھا :

"اتنے سال گزر جانے کے بعد یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ زیادہ ہمدردی کس سے کی جائے۔ ان نو بچوں سے جن کا باپ قتل ہو گیا یا اس نوجوان عورت سے جو ۱۹۶۰ء کے عشرے میں گمراہ ہو گئی؟ پاورز کے نفسیاتی صدمہ پر تو میڈیا نے آنسوؤں کی بالٹیاں بہادیں کہ اسے کس طرح اپنے آپ کو قانون کی گرفت سے بچانے کے لئے بیس سال تک چھپائے رکھنے کے لئے مارے مارے پھرنا پڑا لیکن ان نو یتیم بچوں کی بدقسمتی پر بہانے کے لئے کم ہی آنسو بچے جن کے باپ کو بینک ڈکیتی کے مقابلے کے دوران مار ڈالا گیا"۔ (۱۷)

نکسن کی کتاب سے منقول یہ طویل اقتباسات دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کی سچی عکاسی کرتے ہیں جو آج دنیا کی سب سے بڑی سیاسی طاقت ہے۔ کیا امریکہ دنیا کے تمام ممالک میں اسی نمونے کی جمہوریت کو کارفرما دیکھنے کا متمنی ہے؟ ان اقتباسات میں امریکی جمہوریت کی گھناؤنی تصویر دیکھ کر اس امر میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ یہ نظام جمہوریت دنیا کے کسی بھی معاشرے کو امن و سلامتی سے بہرہ ور کرنے کی ہرگز اہلیت نہیں رکھتا۔ ایسی آزادی جس کی قیمت امن و سلامتی کی قربانی دے کر چکانی پڑے

بلکہ انسان کو اخلاقی اقدار سے محروم کردے اور غارت گر تہذیب و تمدن ہو وہ انسان کے لئے کس کام کی ہے؟ اس کا آخری نتیجہ سراسر ہلاکت و تباہی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ جمہوری تہذیب کے اس کڑوے پھل کو چکھنے کے بعد ایسی ناکارہ جمہوریت کو سینے سے لگائے رکھنے کا امریکہ کے پاس کیا جواز ہے؟ نکسن کے نزدیک اس سوال کا فقط ایک جواب ہے اور وہ یہ کہ اس جمہوریت میں :

"آزادی نے اپنے وسیع ترین معنوں میں 'اپنا دروازہ کھول دیا ہے۔ اندر جو کچھ موجود ہے اسے دیکھ کر اگر ہم مایوس ہو گئے تو یہ دروازہ ہمارے لئے بند ہو جائے گا۔"(۱۸)

گویا جمہوریت کے اندر جو کچھ موجود ہے وہ نکسن کے اپنے الفاظ میں اگرچہ مایوس کن ہے لیکن اسے یہ خوف کھائے جا رہا ہے کہ اگر انہوں نے اپنی مایوس کن جمہوریت سے منہ موڑ لیا تو آزادی کا یہ دروازہ 'جو ایک طویل جدوجہد کے نتیجے میں ان پر کھلا ہے' بند ہو جائے گا۔ گویا ایک نظریۂ حیات کے عملی نتائج کے اعتبار سے جمہوریت نے امریکی معاشرے میں جو گل کھلائے ہیں انہیں نرم ترین الفاظ میں مایوس کن تسلیم کرنے کے باوجود علمی اور فکری سطح پر اسی جمہوریت کو ایک نظریۂ حیات کے طور پر انسانی تاریخ کا آخری نظریہ خیال کیا جا رہا ہے۔ اور اسی نظریہ پر مبنی دنیا میں ایک نیا عالمی نظام قائم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

جب روس امریکہ کے حریف کی حیثیت سے ۱۹۸۹ء میں اپنی طاقت 'مرتبہ اور مقام کھو بیٹھا اور اس کا شیرازہ بکھرنے لگا تو جاپانی نژاد امریکی مورخ فرانسس فوکویاما (Francis Fukuyama) نے امریکی جریدہ "The National Interest" میں "The End of History" کے عنوان سے ایک مقالہ تحریر کیا جس میں یہ دعویٰ کیا گیا کہ بنی نوع انسان کا نظریاتی ارتقاء پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا ہے اور اس لئے انسانی تاریخ بھی اپنے اتمام کو پہنچ گئی ہے۔ فوکویاما اپنا موقف مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کرتا ہے :

"ہمارے مشاہدے میں جو کچھ آ رہا ہے وہ محض سرد جنگ کا خاتمہ یا تاریخ کے کسی خاص دور کی رفت گزشت نہیں 'بلکہ انسانی تاریخ کا اختتام ہے 'یعنی انسان کے

نظریاتی ارتقاء کا نقطۂ آخریں اور انسانی طرز حکومت کی آخری شکل کے طور پر مغربی جمہوریت کی جہانگیری"۔[19]

اس مقالہ کی اہمیت کے پیش نظر جان ٹی۔ رورک (John T.Rourke) نے اسے ۱۹۹۱ء میں اپنی کتاب "Taking Sides" کے مجموعۂ مضامین میں شامل کیا جس سے اس مضمون کا بہت چرچا ہوا۔ چنانچہ مصنف نے ۱۹۹۲ء میں اسی مقالہ کو ایک کتاب کی صورت میں "The End of Hisotry and the Last Man" کے نام سے شائع کیا جسے دنیا بھر میں بہت دلچسپی سے پڑھا گیا اور فوکویاما کا موقف ساری دنیا میں بحث مباحثہ اور نقد و جرح کا موضوع بن گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کتاب پر اب تک مختلف زبانوں میں ایک ہزار کے لگ بھگ مقالات شائع ہو چکے ہیں۔

دنیا کی واحد سپر پاور بن جانے کے بعد امریکہ کے سیاسی مدبرین کا یہ خیال ہے کہ اس کرۂ ارض پر بالقوہ اس کی اجارہ داری قائم ہو گئی ہے جسے وہ بالفعل معرض وجود میں لانے کے لئے نئے عالمی نظام کے پُر فریب نام سے موسوم کرتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکہ کی آج تک یہی خواہش رہی کہ سیاسی اور معاشی اعتبار سے دنیا کے تمام ممالک اس کی قیادت کو قبول کر لیں۔ چنانچہ اپنے واحد حریف روس کی شکست و ریخت کے بعد اس نے اپنے اس استعماری خواب کو عملی جامہ پہنانے کی کوششیں تیز کر دی ہیں۔ ۲۷/ فروری ۱۹۷۶ء کو نکسن کی چینی صدر ماؤزے تنگ سے بیجنگ میں ایک ملاقات ہوئی جبکہ ماؤ بستر مرگ پر تھا۔ اس ملاقات کے دوران عالمی قیادت کے بارے میں اس کی ماؤ سے جو گفتگو ہوئی، اس کا ذکر کرتے ہوئے نکسن لکھتا ہے :

"گفتگو کے دوران میں نے کہا "ہمیں نہ صرف اپنے دو ملکوں کے مابین بلکہ دنیا کے تمام ملکوں کے درمیان امن کے لئے کوشاں ہونا چاہئے۔ اس کا جواب دینے کی ماؤ کی کوشش کا منظر دردناک تھا۔ اس نے بڑبڑاتے ہوئے ہونٹوں سے بمشکل نیم ادا شدہ الفاظ کہے تو اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس کی ترجمان ایک دلکش نوجوان خاتون ماؤ کے لاگو کردہ ڈھیلے ڈھالے اور بے ڈھنگ سوٹ میں ملبوس (چینی عورتوں کے لئے اولڈ گارڈ کمیونسٹوں کی بدترین سزا) ماؤ کی بڑبڑاہٹ کو انگریزی زبان میں ادا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ماؤ خود بھی انگریزی جانتا تھا۔ وہ سمجھ

گیا کہ ترجمان اس کے الفاظ کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکی۔ اس نے اپنے سر کو سخت غصے میں جھٹکا اور اس سے نوٹ بک چھین کر چینی زبان میں اپنے الفاظ تحریر کئے۔ ترجمان نے ان الفاظ کو پڑھ کر بلند آواز میں انگریزی میں کہا : "کیا صرف امن آپ کی آخری منزل ہے؟" مجھے اس سوال کی توقع نہیں تھی۔ میں نے مختصر توقف کے بعد جواب دیا : "ہمیں انصاف کے ساتھ امن کی تلاش کرنی چاہئے"۔ (۲۰)

ماؤزے تنگ نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ نکسن کو جتلادیا کہ کیا امن سے تمہاری مراد تمہارا اپنا من پسند امن ہے جو دنیا کی ایک استعماری طاقت کی حیثیت سے تم دنیا پر مسلط کرنے کے آرزومند ہو؟ لیکن نکسن کا یہ جواب کہ ہم انصاف کے ساتھ امن کے خواہاں ہیں، بھی اس کے پہلے فقرہ کی طرح ہی مبہم تھا، کیونکہ انسانی تاریخ میں یہ کم ہی دیکھنے میں آیا ہے کہ طاقتور کا نظریۂ انصاف کمزور کے نظریۂ انصاف سے مطابقت رکھتا ہو۔ چنانچہ ماؤزے تنگ سے اپنی اس گفتگو کو تازہ کرنے کے فوراً بعد نظریۂ امن کی وضاحت کرتے ہوئے نکسن نے صاف صاف الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ سرد جنگ کے زمانے میں ہمارا نظریۂ امن کچھ اور تھا اور سرد جنگ کے خاتمہ کے بعد ہمارا نظریۂ امن کچھ اور ہے۔ نکسن صاف صاف الفاظ میں لکھتا ہے :

"میرا وہ جواب سرد جنگ کے ضمن میں اکتفا کرتا ہے لیکن آج ریاست ہائے متحدہ کے لئے یہ ایک محدود منزل مقصود ہے۔ اُس وقت ہماری منزل مقصود مشرق و مغرب کی کشمکش کو ختم کرنا تھا تاکہ ایٹمی جنگ سے بچا جائے اور ظلم و فساد پر انصاف اور آزادی کی بالادستی قائم کی جائے۔ آج کمیونزم سرد جنگ ہار چکا ہے اور مارکسزم لینن ازم کا سیاسی نظریہ قطعاً ناکام ہو چکا ہے۔ روس اور امریکہ کے درمیان ایٹمی جنگ کا خطرہ ٹل گیا ہے اور دنیا میں نہایت حقیقی معنوں میں انصاف کے ساتھ امن قائم ہو چکا ہے"۔ (۲۱)

گویا حریف باقی نہ رہے یا زیردست کے درجے میں آجائے تو زبردست کے نزدیک امن اور انصاف کے تمام تقاضے پورے ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اگر زبردست کو دنیا میں بالادستی حاصل ہو جائے تو اسے یہ حق بھی مل جاتا ہے کہ وہ دنیا میں اپنی مرضی کا امن اور

انصاف قائم کرے۔ چنانچہ اب نکسن دنیا میں عدل وانصاف کے مندرجہ ذیل تین اصول بیان کرتا ہے :

"ایک ایسی دنیا میں جس میں کوئی زبردست دشمن ہمارا مدمقابل نہیں رہا ہم دنیا کے ہر معاملے کو اس کے موقع و محل کے مطابق پرکھیں گے۔ ہم دیکھیں گے کہ اس میں ہماری مداخلت ہماری اقدار سے مطابقت رکھتی ہے؟ کیا اس مداخلت سے ہمارے مفادات پورے ہوتے ہیں؟ اور جو فریق معاملے میں براہ راست ملوث ہیں کیا ان کے مفادات (ہماری مداخلت سے) پورے ہوں گے؟"۔ (۲۲)

یعنی پہلا اصول اپنی اقدار کا تحفظ' دوسرا اصول اپنے مفادات کا تحفظ' اور تیسرا اور سب سے آخری اصول یہ ہے کہ معاملے میں براہ راست ملوث ہونے والوں کے مفادات پورے کرنے کا خیال رکھا جائے۔ چنانچہ انہی اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے عراق اور کویت کی جنگ میں "امن وانصاف" قائم کرنے کے لئے دخل اندازی کا جواز پیش کرتے ہوئے نکسن لکھتا ہے :

"کسی بھی جنگ سے ہمارے اتنے اہم مفادات وابستہ نہیں ہوئے جتنے کہ خلیج کی جنگ سے وابستہ تھے۔ لیکن اس معاملے میں ہمارا تیل کے وسائل تک اپنی رسائی کو محفوظ رکھنے کا مقصد بھی ہمارے نظریاتی منتہائے مقصود سے پیوست تھا کیونکہ ہم نے جمہوری مقصد کے تحت کویت کی آزادی کی حفاظت کی"۔ (۲۳)

لیکن کویت کی آزادی' جمہوری مقصد اور امن وانصاف کے نام پر جو انسانیت سوز ظلم وستم عراق کے بے گناہ عوام پر ڈھایا گیا' ایسی بربریت کی مثال پوری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ امریکہ ہیروشیما پر ایٹم بم گرا کر جاپان میں جو تباہی لایا تھا' اس سے ساڑھے سات گنا زیادہ تباہی عراق پر لائی گئی۔ امریکہ کے سابق اٹارنی جنرل ریمزے کلارک کا کہنا ہے کہ خود مسلمانوں کو بھی معلوم نہیں کہ ان پر کتنی تباہی اور بربادی نازل ہوئی اور عراقی مسلمانوں کے نقصان کی وسعت اور سنگینی سے کتنی کے جو چند لوگ واقف ہیں وہ اس پر یقین کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ اس موضوع پر لاس اینجلز میں ۱۶/ اگست ۱۹۹۵ء کو اپنی تقریر کے دوران کلارک نے جو لرزہ خیز حقائق بیان کئے ان میں سے ایک چھوٹا سا اقتباس ذیل میں پیش کیا جاتا ہے :

"بمباری کا مقصد انسانی آبادی کی لازمی بنیادی ضروریات کو تباہ کرنا تھا۔ پینٹاگون کے مطابق چوبیس دنوں کی جنگ کے دوران ایک لاکھ دس ہزار ہوائی حملے کئے گئے جن سے پانی کے بڑے بڑے ذخائر (ڈیم)' پانی صاف کرنے کے کارخانے' زمین سے پمپ کے ذریعے پانی نکالنے کے اسٹیشن اور نہروں کو کنٹرول کرنے کا نظام تاراج ہو گئے۔ پہلے ہی چار دنوں کے اندر اندر پانی کی سپلائی کا کوئی ایک مرکز بھی سالم نہ بچا' ماسوائے چند کنوؤں کے جہاں لوگ ہاتھ سے پانی نکالتے تھے۔ جنگ شروع ہونے کے صرف تیس منٹ کے اندر اندر بجلی کا نوے فیصد نظام ناکارہ کر دیا گیا جس سے خوراک پیدا کرنے کے ذرائع تباہ و برباد ہو گئے۔ دو ماہ کے اندر نوے فیصد پولٹری' چار ماہ کے اندر ساٹھ فیصد دودھ اور گوشت مہیا کرنے والے جانور ہلاک کر دیئے گئے۔ اناج پیدا کرنے یا اناج درآمد کرنے کی اہلیت نہ رہی۔ اناج کا کوئی ذخیرہ بھی باقی نہ بچا۔ عراق اپنی خوراک کا چالیس فیصد درآمد کیا کرتا تھا اور ساٹھ فیصد خود پیدا کرتا تھا۔ شدید بمباری کے نتیجے میں آئندہ چار سال میں خوراک کی پیداوار دو تہائی کم ہو گئی۔ صرف بیالیس دنوں کے دوران اٹھاسی ہزار ٹن گولہ بارود برسایا گیا جو ہیروشیما پر گرائے گئے ایٹم بم سے ساڑھے سات گنا زیادہ تباہی لایا۔ اس بمباری کی وجہ سے عراق اپنی آبادی کی بنیادی ضروریات زندگی پوری کرنے سے قاصر ہو گیا"۔ (۲۴)

ریمزے کلارک کے بیان کے مطابق اس خلیجی جنگ کے دوران اور مابعد جنگ پانچ سال کے دوران پانچ لاکھ افراد لقمۂ اجل بن گئے۔ یونیسف کی رپورٹ کے مطابق پانچ سال سے کم عمر کے جو بچے ہلاک ہوئے ان کی تعداد ساڑھے تین لاکھ سے زائد تھی۔ جنگ کے بعد عراق کے خلاف لگائی گئی اقتصادی پابندیوں کے نتیجے میں بیماریوں کے علاج میں کام آنے والی دواؤں کی درآمد بھی بند تھی جس کی وجہ سے معمر' سن رسیدہ اور مزمن بیماریوں میں مبتلا لوگوں کی اموات میں بے حد اضافہ ہوا اور عالمی ادارۂ صحت کے اندازے کے مطابق عراق میں فی کس اوسط عمر میں بیس سال کی کمی رونما ہوئی۔ سنگدلی کی انتہا یہ ہے کہ عائد شدہ اقتصادی پابندیوں کی وجہ سے وہ نئی پیدا ہونے والی نسل بھی برباد ہو گئی جس نے ابھی دنیا میں آنکھ بھی نہیں کھولی تھی۔ حاملہ عورتوں کو ناقص خوراک ملنے

کی وجہ سے دو کلو سے کم وزن کے بچوں کی پیدائش میں پانچ گنا اضافہ ہوا۔ ایسے کم وزن بچے عمر بھر صحت مند زندگی کے قابل نہیں رہتے۔ اس بنا پر عالمی ادارۂ صحت کی رپورٹ میں یہ بات ریکارڈ پر ہے کہ جنگ کے بعد پانچ سال کے دوران پیدا ہونے والی عراقی نسل ایک بیمار اور بونی (Stunted) نسل ہوگی۔ چنانچہ اس بے رحمی اور سفاکی اور گھناؤنے انسانیت سوز ظلم پر بیدار ضمیر ریمزے کلارک پکار اٹھتا ہے :

"That is crime against humanity of enormous magnitude"

یعنی (انسانیت کے خلاف یہ ایک بے حد و وسعت جرم ہے)(۲۵)

لیکن نکسن کے نزدیک "کویت کی آزادی کی حفاظت" اور "جمہوریت کی سربلندی" جیسے عظیم مقاصد کے لئے یہ سفاکانہ ظلم اور بربریت بالکل روا ہے۔ خلیجی جنگ کے دوران اور اس کے بعد امریکہ اور مغربی دنیا کے کئی جمہوری ممالک کے میڈیا صدام حسین کی ضد، ہٹ دھرمی اور آمرانہ طور طریقوں کو کوستے رہے۔ لیکن ایک آمر کو سزا دینے کے لئے پانچ لاکھ بے گناہ انسانوں اور ساڑھے تین لاکھ بچوں کا سفاکانہ قتل اور جو بچے ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے، انہیں رحم مادر میں ہی ناکارہ کر دینے کا ظلم عظیم صرف مغربی "جمہوری اخلاق" (Democratic Ethics) میں ہی روا رکھا جا سکتا ہے۔ اور یہ ہے دنیا میں "انصاف کے ساتھ امن قائم" کرنے کی "معصوم خواہش" کی ایک جھلک جو نکسن جیسے "صحیح الفکر" انسان کے ضمیر میں ہلکی سی خلش پیدا یا اس کی آنکھ سے ایک آنسو بھی ٹپکا نہیں سکتی!

ہم اوپر دیکھ آئے ہیں کہ نکسن کو اس بات کا اعتراف ہے کہ جمہوریت کے اندر جو کچھ ہے وہ مایوس کن ہے۔ اور یہ جمہوریت باہر کی دنیا کے سامنے "انصاف کے ساتھ امن" کا جو منظر پیش کر رہی ہے وہ دنیائے انسانیت کے لئے دہشت ناک اور ہولناک ہے، لیکن نکسن کے لئے مایوس کن نہیں بلکہ بزعم خویش وہ دنیا کو امن اور انصاف کی برکات سے مستفید کر رہے ہیں!

شہرۂ آفاق مصنف ایلون ٹافلر، جس کی دانشوری کا اعتراف دنیا بھر کے حکمرانوں

مثلاً ریگن، گورباچوف اور زہاؤ زیانگ نے کیا ہے، بڑی صاف گوئی سے کہتا ہے کہ دنیا کو آج جس تہذیب کا سامنا ہے وہ ہتھیاروں اور جنگ کی تہذیب ہے۔ پھر اس اعتبار سے وہ امریکہ کی غیر معمولی کامیابیوں کا ذکر کرتے ہوئے بڑے فخر سے لکھتا ہے :

"صدام نے بڑ ہانکی تھی کہ اتھادی ام المحارب (عراق کی جنگ) میں ریزہ ریزہ ہو کر پیوند خاک ہو جائیں گے۔ مغربی میڈیا کے پنڈتوں اور سیاست دانوں نے اس خیال کو خوب اچھالا اور اتحادیوں کے بہت زیادہ نقصانات کی پیش گوئیاں کیں۔ اور بعض لوگوں کا تو یہ اندازہ تھا کہ تیس ہزار آدمی قتل ہو جائیں گے اور بعض فوجی تجزیہ نگاروں نے بھی اس کی تصدیق کی۔ لیکن عملاً کیا ہوا، صرف تین سو چالیس اشخاص (امریکی) کام آئے، یعنی قریباً ان تخمینوں کا سواں حصہ!"(۲۶)

وہ مزید لکھتا ہے :

"جنرل پیرے گیلاؤس (Gen. Pierre Gallois) نے یہ بات قلم بند کی ہے کہ امریکہ نے خلیجی جنگ میں پچاس ہزار فوجی بھیجے اور بیس ہزار ان کی پشت پناہی کرنے اور ساز و سامان مہیا کرنے پر مامور کئے تھے لیکن عملاً صرف دو ہزار سپاہیوں نے جنگ جیت لی۔"(۲۷)

ایلون ٹافلر نے اپنی کتاب "War and Antiwar" میں عسکری اعتبار سے امریکہ کی عالمی برتری کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ امریکہ نے عراق میں دنیا کی پہلی "انفارمیشن وار" لڑی۔ اس نئی طرز جنگ نے دنیا کے تمام روائتی جنگی طور طریقوں کو متروک کر دیا ہے۔ عراق میں اس طریقہ جنگ کے مظاہرہ سے ثابت ہو گیا ہے کہ کمپیوٹروں میں استعمال ہونے والا سلیکون کا ایک اونس ایک ٹن یورانیم پر فوقیت رکھتا ہے۔(۲۸)

حیاتیاتی طریقہ جنگ (Biological Warfare) میں امریکہ کی محیرالعقول ترقی کا ذکر کرتے ہوئے ٹافلر لکھتا ہے کہ اس قسم کی جنگ لڑنے کے لئے ہتھیاروں میں امریکہ کی ترقی کا یہ عالم ہے کہ دشمن کی افواج کو چشم زدن میں ایسی ایسی خوفناک بیماریوں میں مبتلا کیا جا سکتا ہے کہ ان کے ہوش و حواس جواب دے جائیں، وہ اسہال کے مرض میں مبتلا ہو کر بالکل بے جان ہو کر رہ جائیں۔ صرف ایک کو زکام کی وبائی چھوت لگا کر پورے کے

پورے شہروں کو صرف چند گھنٹوں کے اندر اندر دبائی لپیٹ میں لایا جا سکتا ہے جس سے ان کے ہوش و حواس مختل ہو جائیں اور وہ بالکل لاچار ہو جائیں۔ بعض ماہرین کا یہ اندازہ ہے کہ امریکہ کے پاس ایٹمی اسلحہ کا اتنا بڑا ذخیرہ ہے کہ اس کے ذریعے پورے کرۂ ارض کو پینتیس مرتبہ مکمل طور پر تباہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن تمام تر عسکری برتری کے باوجود امریکہ میں جو خوف و ہراس پایا جاتا ہے اس کا ایک عکس ایلون ٹافلر کی تحریر کے مندرجہ ذیل اقتباس میں دیکھئے :

"نپولین کی مثال' اگر کوئی اور مثال نہ بھی ہو' ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ طاقت و قوت کتنی ناپائیدار اور آنی جانی چیز ہے۔ ۱۸ جون ۱۸۱۵ء کے روز' مشرق کی جانب آخری کناروں تک اپنی سلطنت کو وسعت دینے کے بعد تین سال سے بھی کم عرصے میں' واٹرلو کی لڑائی میں اس کی ساری طاقت اور قوت تباہ و برباد ہو گئی اور فرانس کی "یک قطبی" آن بان اور اس کی حیثیت بطور "سپر پاور" ایک مختصر سی جھلک دکھا کر غائب ہو گئی۔ کیا امریکہ کو بھی اسی قسم کی صورت حال پیش آ سکتی ہے؟ کیا امریکہ کی یک قطبی شان و شوکت بھی تاریخ کی حدت میں سوختہ ہو کر ختم ہو جائے گی؟"(۲۹)

ایک طرف تو ایلون ٹافلر امریکہ کی عسکری برتری کا ایسا نقشہ کھینچتا ہے گویا ایسے تمام امکانات یکسر معدوم ہو گئے ہیں کہ دنیا کا کوئی ملک یا دنیا کی کوئی قوم امریکہ سے ٹکر لینے یا اس کے سامنے آنے کے بارے میں سوچنے کی بھی جرأت کر سکے اور دوسری طرف وہ اپنے دل میں جنگ سے اس قدر خوفزدہ ہے کہ اپنی کتاب "War and Antiwar" کا آغاز اور اختتام ٹراٹسکی کے اس جملے پر کرتا ہے :

"آپ چاہے جنگ میں دلچسپی نہ بھی رکھتے ہوں لیکن جنگ آپ میں ضرور دلچسپی رکھتی ہے"۔

یہی حال نکسن کا ہے۔ وہ ایک طرف تو یہ کہتا ہے کہ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد دنیا میں حقیقی معنوں میں امن اور انصاف قائم ہو چکا ہے' لیکن دوسری طرف وہ امریکیوں کے خوف کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے :

"دوسری جنگ عظیم کے خاتمے نے امریکی عوام میں جذبۂ تفاخر' اختراع اور

مقصدیت کی چنگاریوں کو بھڑکا کر ملک کو پچاس سال تک (ترقی و تعمیر کی راہ پر) رواں دواں رکھا۔ لیکن اس کے برعکس سرد جنگ کے خاتمے نے امریکیوں کو ذہنی الجھاؤ اور مستقبل کے بارے میں خوف و ہراس میں مبتلا کر دیا ہے"۔ (۳۰)

سوال یہ ہے کہ دنیا کی واحد عالمی طاقت بن جانے کے بعد امریکہ آخر خوفزدہ کس بات سے ہے؟ نکسن اس صورت حال کا تجزیہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ اس کا واحد سبب "سرابِ آرزو" ہے۔ وہ لکھتا ہے :

"کمیونزم کو شکست دینے کا کام قومی توانائیوں کو چاٹ جانے والا مشن تھا۔ اس کے پورے پورے معاوضے کی امیدیں قائم کرنا اور یہ توقعات وابستہ کرنا کہ کمیونزم کی شکست کے بعد حالات بہت بہتر اور امریکی آسودہ حال ہو جائیں گے' جائز اور بجا تھا۔ لیکن جب امریکی عظیم امن قائم ہونے کے باوجود اس سے متوقع فوائد حاصل کرنے میں بری طرح ناکام رہے تو اس کے منطقی نتیجے کے طور پر ان کے امیدوں بھرے سینے شق ہو گئے اور انہیں یہ احساس ہوا کہ عظیم امن تو درحقیقت ایک فریب عظیم ہے"۔ (۳۱)

"پینتالیس سال تک امریکیوں کو عالمی امن کی موعودہ سرزمین کی طرف کبھی بہلا پھسلا کر اور کبھی جوش دلا کر ہانکا گیا اور اس سرزمین پر پہنچ کر ان پر منکشف ہوا کہ یہ تو ایک ایسی سیاسی دلدل ہے جس پر اس نئی تہذیب کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی جس کا خواب عملاً پورا ہونے کی توقعات انہوں نے کمیونزم کی شکست کے ساتھ وابستہ کر رکھی تھیں"۔ (۳۲)

شاید انسانی تاریخ کا یہ سب سے بڑا المیہ ہے کہ امریکی قوم فاتح عالم ہونے اور دنیا کی واحد سپر پاور ہونے کے باوجود عین عروج کے زمانے میں حوصلہ ہار چکی ہے اور مایوسی کا شکار ہے۔ اور جس ارضی جنت کی تلاش میں وہ آج سے پچاس سال پہلے نکلی تھی وہ اس کے لئے ایک سرابِ آرزو ثابت ہوا ہے۔

نکسن اپنی فاتح عالم مگر شکست خوردہ قوم کا حوصلہ بلند کرنے کی فکر میں صورت حالات کا تجزیہ کرتا ہوا اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ جمہوریت کی صورت میں آزادی کا جو خواب انہوں نے دیکھا تھا وہ اندرون ملک مایوس کن ثابت ہوا اور پوری دنیا میں واحد

سپر طاقت بن جانے کے بعد دنیا میں قیام امن کا جو خواب دیکھا گیا تھا وہ بھی ساتھ ہی چکنا چور ہو گیا۔ چنانچہ جب وہ اپنی داخلی اور خارجی ناکامیوں کے اسباب تلاش کرتا ہے تو اسے داخلی ناکامیوں کے سلسلے میں بنیادی اور سب سے بڑی خرابی یہ نظر آتی ہے کہ ہر خرابی کی جڑ ان کے اپنے اندر پائی جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے :

"آج جبکہ ہم حالت امن میں ہیں' جو چیلنج ہمیں درپیش ہے وہ یہ ہے کہ ہم دنیا پر یہ ثابت کر دیں کہ ہم ورائے امن بھی اقوام عالم کی رہنمائی کی اہلیت اور عزم رکھتے ہیں۔ لیکن اس وقت ہمارا دشمن ہمارے اندر موجود ہے کوئی غیر قوم نہیں"۔

اندر کے دشمن پر قابو پانے کے لئے وہ مذہب کی قوت کو بروئے کار لانے کا آرزو مند ہے اور وہ مذہب کو جمہوریت کے استحکام کے لئے ناگزیر خیال کرتا ہے۔ مشہور امریکی مورخ الیکسی ڈی ٹوکوول کا حوالہ دیتے ہوئے وہ لکھتا ہے : (۳۳)

"آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے الیکسی ڈی ٹوکوول نے امریکی زندگی کے بارے میں نہایت بصیرت افروز باتیں کہی تھیں۔ اس نے خاص طور پر امریکی طرز زندگی' قانون' افکار' اخلاق اور قومی خود شناسی کے سلسلے میں مذہبی روایات کے بہت گہرے اور دیرپا اثرات کا ذکر کیا تھا۔ وہ دیگر تمام طریقہ ہائے حکومت کے معاملے میں جمہوری ریاستوں کے لئے مذہب کو بے حد اہم سمجھتا تھا کیونکہ مذہب ہی سے حسنات' مدنیت' اخلاقی ذمہ داریوں کا احساس' جزائے اُخروی کے لئے ضبط نفس اور دوسروں کی خیر خواہی جیسے اعلیٰ اوصاف جنم لیتے ہیں جن پر جمہوریت کا زیادہ تر انحصار ہوتا ہے۔ نیز مذہبی عقائد ہی انسان کی "کاملیت بے پایاں" کے اس غرور کا تدارک کر سکتے ہیں جس کی طرف جمہوریتیں خاص طور پر لڑھک جانے کا میلان رکھتی ہیں"۔ (۳۴)

نکسن اس بات پر بہت زور دیتا ہے کہ حکومت لوگوں کے دلوں تک رسائی حاصل نہیں کر سکتی لیکن مذہب کر سکتا ہے۔ اس لئے وہ مذہب کی اہمیت کو واضح کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ الیکسی ڈی ٹوکوول کی بات ڈیڑھ سو سال پرانی بات ہے اس لئے شاید آج زیادہ قابل التفات نہ سمجھی جائے۔ چنانچہ وہ اپنے ایک ہمعصر کا قول

پیش کرتے ہوئے رقمطراز ہے :

"امریکہ کی تجدید کے لئے ہمیں روحانی وسیلے سے کام لینا چاہئے۔ آج سے دو سال پہلے ہنری گرون والڈ نے کہا تھا کہ ہم مذہب کے اس نئے عہد کی طرف پیش قدمی کر رہے ہیں جب مذہب ہماری زندگیوں پر بہت زیادہ اثر انداز ہوگا۔ دنیا کے تمام بڑے مذاہب' عیسائیت' یہودیت' اسلام اور بدھ مت نے روحانی اقدار پر زور دیا اور صدیوں تک انہیں متاثر کئے رکھا۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ انسان کسی ایسی حقیقت پر ایمان رکھتا ہے جو اس سے عظیم تر ہو۔ دوستووسکی نے اپنی کتاب "The Possessed" میں سٹیفن ٹراموچ درخووسکی کے منہ سے یہ بات کہلوائی ہے کہ حیات انسانی کا یہ ایک اہم تقاضا ہے کہ انسان کسی لامحدود ہستی کے سامنے سرنگوں رہنے کے قابل رہے۔ اگر انسانوں کو لامحدود ہستی (کے تصور) سے محروم کر دیا جائے تو وہ زندہ رہنے کے قابل نہیں رہیں گے اور مایوسی سے مرجائیں گے"۔ (۳۵)

چنانچہ نکسن نے اپنی زندگی میں اپنی قوم کو بار بار تاکید کی کہ اگر وہ سیاست کی اصلاح چاہتے ہیں تو مذہب کے ذریعے اپنی روحانی اصلاح پر توجہ دیں۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے :

"پچیس سال پہلے میں نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا تھا کہ ہمیں جس روحانی بحران کا سامنا ہے اس سے نمٹنے کے لئے روحانی حل کی ضرورت ہے۔ یہ بات آج بھی اتنی ہی درست ہے جتنی کہ اس وقت تھی۔" (۳۶)

اندورنی مسائل پر قابو پانے کے لئے جس روحانی اصلاح کی ضرورت ہے وہ تو شاید مذہب کی طرف رجوع کرنے سے کسی حد تک حاصل ہو جائے لیکن عالمی امن کے لئے جس قسم کا انسانیت پرور آفاقی اخلاق درکار ہے وہ کہاں سے آئے گا؟ نکسن جیسا شخص' جس کے خیالات پر مذہب کی گہری چھاپ نظر آتی ہے' انسانی اعتبار سے اتنا بے درد ہے کہ اس کا ضمیر عراق کے لاکھوں بے گناہ شہریوں' عورتوں' بچوں اور معذور بوڑھوں کے سفاکانہ قتل پر ذرا سی خلش بھی محسوس نہیں کرتا!!! بلکہ وہ کویت کی آزادی کا بہانہ بنا کر اور اسے اپنے جمہوری مقاصد کی پاسداری کا نام دے کر عراق میں ہر قسم کے ظلم و ستم اور انسانیت سوز بربریت کا جواز پیش کرتا ہے اور ضمیر کے کامل اطمینان سے بل سیفائر کا یہ

مقولہ دہراتا ہے :

"امریکہ کبھی ایسے مقصد کا دفاع اپنی جانوں سے نہیں کرے گا جس کا دفاع وہ اپنے ضمیر سے نہیں کر سکتا۔"(۳۷)

کیا یہ ممکن ہے کہ انسانی ضمیر کسی غیر قوم کے لاکھوں بے گناہ انسانوں کے قتل کا دفاع پیش کر سکے؟ مگر نکسن نے ایسا کیا ہے اور بقول علامہ اقبال یہ ایک فساد زدہ خودی (Perverted ego) کی علامت ہے۔ ان کے خیال میں اس فساد کا آغاز یورپ میں لوتھر کی مذہبی اصلاح کی تحریک سے ہوا تھا جس میں عیسائیت کے آفاقی اخلاق کو قومی اخلاق نے بے دخل کر دیا۔(۳۸) چنانچہ یورپ کی فساد زدہ خودیاں باہم دگر حریف جمہوریتوں کی شکل میں دولت مندوں کی خاطر نادار وں کا حق چھین کر اپنے تقاضے پورے کرتی رہیں۔ امریکہ ایک الگ تھلگ ملک ہونے کی حیثیت سے جمہوریت کے ان اثرات بد سے بچا ہوا تھا۔ نیز شروع شروع میں جن عظیم شخصیات نے امریکہ میں جمہوریت کی آبیاری کی اور اسے نشوونما دی وہ انسانیت دوست لوگ تھے لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد جب عالمی سیاست میں امریکہ نے سرگرمی سے حصہ لینا شروع کر دیا تو قوم پرستی انسان دوستی پر غالب آنے لگی اور امریکی قوم کی خودی بھی فساد زدہ ہو گئی' اور امریکہ میں اگرچہ مذہب سے بیزاری کا ابھی وہ رجحان پیدا نہیں ہوا جو یورپ میں اپنی انتہا کو پہنچ گیا تھا لیکن انسانیت پرور اخلاق پر قوم پرور اخلاق کو بالادستی مل جانے کی وجہ سے ایسے غیر انسانی مذہبی رویے پیدا ہو گئے ہیں کہ نکسن جیسے مذہب پرست انسان کا ضمیر بھی خلیجی جنگ میں ہونے والے انسانیت سوز مظالم کا دفاع پیش کرتا ہے!

آج امریکہ دنیا میں جمہوریت کا سب سے بڑا چیمپئن ہے۔ لیکن اس جمہوریت نے امریکہ کو کیا دیا ہے؟ خود نکسن کے اپنے الفاظ میں "اندر جو کچھ ہے مایوس کن ہے" لیکن اسے چھوڑنا اس لئے ممکن نہیں کہ اس سے نکلنے کے بعد کہیں آزادی کا "دروازہ بند نہ ہو جائے"۔ وہ یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ امریکی معاشرہ ڈراؤنا اور سہما سہما ہے اور امامت عالم کی ذمہ داریاں سنبھالنے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔ آخر کیوں؟

امریکہ کو جان لینا چاہئے کہ دنیا میں قیام "امن" کے لئے جس نئے عالمی نظام کا

خواب وہ دیکھ رہا ہے وہ محض فوجی طاقت کے بل بوتے پر قائم نہیں کیا جا سکتا' نہ ہی مختلف اقوام اور ممالک کو معاشی پابندیوں کی بیڑیوں میں جکڑ کر کوئی پائیدار امن یا مستحکم عالمی نظام قائم کیا جا سکتا ہے۔ مجرم ضمیری اور دلوں کا خوف و ہراس ان عظیم مقاصد کے حصول میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ اور نکسن اور ایلون ٹافلر کی تحریریں اسی مایوسی کی آئینہ دار ہیں۔

شاید وہ وقت قریب آلگا ہے کہ عالمی مدبرین اسلام کی تہذیب آفریں' انسانیت پرور اور وحدت خیز قوت پر توجہ دیں۔ اور حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ عالمی مدبرین کی توجہ اس طرف مبذول ہو رہی ہے۔ نکسن اپنی کتاب "Seize the Moment" میں واضح طور پر مسلم تہذیب کی برتری کا قائل نظر آتا ہے۔ وہ لکھتا ہے :

"اگرچہ مسلم دنیا سیاسی ارتقاء میں مغرب سے پیچھے ہے (اس وقت دو مسلمان ملکوں میں جمہوری حکومتیں قائم ہیں) ہماری تہذیب ان کی تہذیب سے خلقی اور فطری اعتبار سے ہرگز برتر نہیں۔ کمیونزم کی اپیل کا مقابلہ کرنے میں مسلم دنیا مغربی اقوام سے زیادہ سخت جان اور قوی ثابت ہوئی۔ اور مغرب کی مادیت اور اخلاقی مداہنت (جنسی اباحیت) کو رد کرنے میں اس تہذیب نے جس استقامت کا ثبوت دیا وہ مسلمانوں کے حق میں جاتی ہے"۔ (۳۹)

اسی طرح برطانوی شہزادہ چارلس (پرنس آف ویلز) کھلم کھلا اعتراف کرتا ہے کہ :

"اسلام ہمارے (یعنی اہل مغرب کے) ماضی اور حال کی تمام انسانی جدوجہد اور سرگرمیوں میں حصہ دار رہا ہے۔ اسی کی مدد کی بدولت ہم نے جدید یورپ تخلیق کیا۔ یہ ہماری اپنی وراثت کا ایک لازمی حصہ ہے' اس سے الگ چیز نہیں.... اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ یہ ہمیں آج کی دنیا کو سمجھنے اور اس میں زندگی بسر کرنے کیلئے ایک ایسے طریقہ کی تعلیم دے سکتا ہے جسے کھو کر عیسائیت افلاس زدہ اور پسماندہ ہو گئی ہے"۔ (۴۰)

تمام مغربی ممالک آج لادینی جمہوریت کے جس عذاب میں مبتلا ہیں اس کے بارے میں علامہ اقبال نے اہل مغرب کو پون صدی پیشتر ہی متنبہ کر دیا تھا ؎

زمن دہ اہل مغرب را پیامے
کہ جمہور است تیغ بے نیامے
چہ شمشیرے کہ جانہا می ستاند
تمیزِ مسلم و کافر نداند
نہ ماند در غلافِ خود زمانے
برد جانے خود و جانِ جہانے (۴۱)

(میری طرف سے اہل مغرب کو یہ پیغام دو کہ جمہوریت ایک ایسی تیغ بے نیام ہے جو ہر ایک کی جان نکال لیتی ہے' اسے مسلم و کافر کی تمیز نہیں۔ یہ کسی بھی وقت نیام میں نہیں رہتی' اپنی جان بھی گنواتی ہے اور دنیا جہان کی جان بھی۔)

می کند بند غلاماں پختہ تر
حریت می خواند او را بے بصر
گرمیٔ ہنگامۂ جمہور دید
پردہ بر روئے ملوکیت کشید (۴۲)

(سیاسیات حاضرہ یعنی جمہوری سیاست غلاموں کی زنجیروں کو اور بھی مضبوط بناتی ہے لیکن بے بصیرت لوگ اسے آزادی کا نام دیتے ہیں۔ حقیقت فقط اتنی ہے کہ لوگوں میں جمہوریت کا غلغلہ دیکھ کر ملوکیت پر پردہ ڈال دیا گیا ہے۔)

وائے بر دستورِ جمہورِ فرنگ
مردہ تر شد مردہ از صورِ فرنگ (۴۳)

(فرنگی جمہوریت پر افسوس کہ اس کی بانگ صور سے مردہ اور بھی زیادہ مردہ ہو گیا)

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر (۴۴)
ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے کہ آزادی کی ہے نیلم پری (۴۵)

جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی (۴۶)

مغربی مفکر اور دانشور لادینی جمہوری تہذیب سے مایوس ہو کر اسلام کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔ علامہ اقبال نے اس کی پیش بینی کرتے ہوئے کہا تھا :

"آج کے مسلمان کو چاہئے کہ وہ اپنے مقام (اور اپنی حیثیت) کا احساس کرے اور اسلام کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں اپنی معاشرتی زندگی کی از سر نو تعمیر کرے اور دنیا پر اسلامی مقصود کی جزوی تکمیل جو ظاہر ہوئی ہے اسے ترقی دے کر "روحانی جمہوریت" تک لے جائے جو اسلام کا منتہائے مقصود ہے"۔ (۴۷)

کتابیات

(1) *Ali Mazrui, The American Journal of Islamic Social Sciences (Vol.10, No.4) International Institute of Islamic Thought, Washington D.C., 1993.*

(2) *Alvin Toffler. War and Antiwar, Warner Books, A Division of Little Brown And Company, London, 1994.*

(3) *Prince Of Wales, The American journal of Islamic Social (Vol.10.No.4) International Institute of Islamic Thought, Washington D.C., 1993.*

(4) *Muhammad Iqbal, The Reconstruction of Religious Thought in Islam, (Ed. Saeed Shaikh) Institute of Islamic Culture, Abbot Road, Lahore, 1984.*

(5) *Ramsey Clarke, Impact International (Vol 25, No. 9 Sept. 1995) News and Media, Seven Sisters Road, London N4 BL UK, 1995.*

(6) *Richard Nixon, Beyound Peace, Random House, New York, 1994.*

(7) *Richard Nixon, Seize the Moment, Simon and Schuster, Rockefeller Centre, 1230 Avenue, New York, 1992.*

(8) محمد اقبال، کلیات اقبال (فارسی) شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور 1973ء

(9) محمد اقبال، کلیات اقبال (اردو) شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور 1973ء

حوالہ جات

(صفحہ نمبر سے پہلے کتابیات کی کتاب کا نمبر دیا گیا ہے)

(۱) ۶ ص ۲۲۰ (۲) ۶ ص ۲۱۹ (۳) ۶ ص ۲۱۹
(۴) ۶ ص ۲۱۳ (۵) ۶ ص ۲۱۳ (۶) ۶ ص ۲۱۷-۲۱۸
(۷) ۶ ص ۲۲۹ (۸) ۶ ص ۲۲۸-۲۲۹ (۹) ۶ ص ۲۲۹
(۱۰) ۶ ص ۲۳۵ (۱۱) ۶ ص ۲۲۴ (۱۲) ۶ ص ۲۲۴
(۱۳) ۶ ص ۲۲۴ (۱۴) ۶ ص ۲۲۱ (۱۵) ۶ ص ۲۳۱
(۱۶) ۶ ص ۲۳۲ (۱۷) ۶ ص ۲۳۲ (۱۸) ۶ ص ۲۴۹
(۱۹) ۶ ص ۵۱۲ (۲۰) ۶ ص ۴ (۲۱) ۶ ص ۳۷
(۲۲) ۶ ص ۳۹ (۲۳) ۶ ص ۳۷ (۲۴) ۵ ص ۱۷
(۲۵) ۵ ص ۱۷ (۲۶) ۲ ص ۸۰ (۲۷) ۲ ص ۹۶
(۲۸) ۲ ص ۸۶ (۲۹) ۲ ص ۲۳۸ (۳۰) ۶ ص ۲۴۳
(۳۱) ۶ ص ۲۴۳ (۳۲) ۶ ص ۲۴۳ (۳۳) ۶ ص ۲۴۵
(۳۴) ۶ ص ۴۷ (۳۵) ۶ ص ۲۳۷ (۳۶) ۶ ص ۱۷۴
(۳۷) ۶ ص ۳۸ (۳۸) ۴ ص ۱۲۹ (۳۹) ۷ ص ۲۳۰
(۴۰) ۳ ص ۴۰ (۴۱) ۸ ص ۵۶۰ (۴۲) ۸ ص ۸۳۱
(۴۳) ۸ ص ۶۶۰ (۴۴) ۹ ص ۶۶۰ (۴۵) ۹ ص ۲۶۱
(۴۶) ۹ ص ۳۲ (۴۷) ۹ ص ۱۲۴

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

حضرت امام شامل ؒ کا تابناک کردار

اظہار احمد قریشی

میں خوش قسمت ہوں کہ برخوردار عزیزم عاکف سعید نے مجھے حضرت امام شامل ؒ پر ایک یہودی جناب موشے گامر کی ایک اور عمدہ اور جدید کتاب امریکہ سے لا کر دی۔ خداوند کریم کی اس امداد کے لئے میں یہی کہہ سکتا ہوں ع اک بندۂ عاصی کی اور اتنی مداراتیں! چنانچہ اب میرے پاس اس سے قبل کی Lesley Blanch کی کتاب سمیت غیر مسلموں کی لکھی ہوئی دو کتابیں ہیں' جن سے میں امام صاحب کی ذات اور ان کے کارناموں کے متعلق مواد لے رہا ہوں۔ یہ مواد پوری طرح چھان پھٹک کر مصدقہ ہے۔ لیسلے بلانچ کی کتاب کے صفحہ ۳۵۷ پر لکھا ہے کہ :

"حضرت امام شامل ؒ کی ذاتی زندگی میں کوئی عیب نہیں نکالا جا سکتا تھا۔ ان لوگوں میں جمہوری اصول کار فرما تھے۔ چنانچہ عوام اپنے امام پر نہ صرف تنقید کر سکتے تھے بلکہ اسے ناکارہ تک قرار دے سکتے تھے"۔

اس کے علاوہ لیسلے بلانچ صاحبہ نے حضرت امام شامل ؒ کی درجنوں جگہ پر بہت تعریف کی ہے' جسے میری کتاب "حضرت امام شامل ؒ" میں دیکھا جا سکتا ہے۔ جناب موشے گامر اپنی کتاب کے باب نمبر ۲۲ میں لکھتے ہیں :

☆ "بعض روسی لکھنے والے جو یہ کہتے ہیں کہ امام شامل ؒ شریعت کو سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرتے تھے' یہ بالکل غلط ہے ... درحقیقت امام صاحب ایک نیک اور پرہیزگار مسلمان تھے جن کا اسلامی قانون اور اسلامی طرز زندگی پر پورا پورا ایمان تھا اور ان کے تمام اعمال ان کے اعتقادات پر اور ان کی فرض شناسی پر مبنی ہوتے تھے"۔

☆ "مسلمان علماء کی پُرجوش اور ہمہ وقت تائید جو امام صاحب کو حاصل تھی یہ ہرگز امام

صاحب کے اقتدار اور اختیار کے بل پر نہیں تھی' بلکہ اس کا سبب ان علماء کا امام صاحب کے نظریات سے کلی اتفاق اور امام صاحب پر مکمل اعتماد تھا اور یہ سب کچھ امام صاحب کے شریعت پر چلنے اور بے داغ زندگی گزارنے کی وجہ سے تھا"۔

☆ "امام صاحب خود ایک بڑے عالم اور صوفی شیخ تھے۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ امام صاحب علماء کی عزت کرتے تھے اور وہ اپنے ہم خیالوں کو یہ یقین کرانے میں کامیاب تھے کہ جملہ معاملات کے فیصلوں میں ان کا بھی دخل ہے۔ چنانچہ علماء سے نہ صرف شرعی امور میں رائے لی جاتی تھی بلکہ وہ ایسے اجلاسوں میں بھی شریک ہوتے تھے جن میں پالیسی اور جنگی حکمت عملی پر بھی بحث اور فیصلے ہوتے تھے"۔

☆ "جناب امام شامل اپنے مرشد جمال الدین صاحب کے ساری عمر تابع فرمان رہے اور اپنی حکومت کے سارے زمانے میں وہ ان کی بے حد عزت کرتے تھے۔ یہ امر باعث حیرت ہے' کیونکہ کسی صاحب اقتدار کا خود کو مسلسل اپنے مرشد کی فرمانبرداری اور تابعداری میں رکھنا' مرید اور مرشد دونوں کی اعلیٰ ظرفی اور پختہ کردار کا بین ثبوت ہے"۔

☆ "امام شامل" اپنے مرشد جمال الدین صاحب کی ہر خواہش کو اپنے لئے حکم سمجھتے تھے۔ ۱۸۴۲ء میں امام صاحب نے غازی غموق پر حملہ کیا کیونکہ انہیں خیال ہوا کہ یہ جمال الدین صاحب کی خواہش ہے۔ ایک سال بعد امام صاحب نے "دیوان" قائم کر دیا کیونکہ یہ بھی جمال الدین صاحب کا مشورہ تھا۔ اس کے علاوہ روسی قیدیوں کو رہا کرنے یا نہ کرنے کے متعلق بھی امام صاحب اپنے مرشد کی ہدایت پر عمل کرتے تھے"۔

☆ "جناب مرشد' امام صاحب کے راستہ میں رکاوٹ نہیں تھے بلکہ ان کے مشورے بڑے عقلمندی پر مبنی ہوتے تھے' جن سے امام صاحب کو بڑا فائدہ ہوتا تھا۔ جمال الدین صاحب اپنی تقاریر اور اپنے خطوط میں عوام پر زور دیتے تھے کہ وہ امام صاحب کا کہنا مانیں اور ان کی پیروی کریں۔ اس کے علاوہ جمال الدین صاحب مقامی

حکمرانوں سے اپنے تعلقات کو امام صاحب کے حق میں استعمال کرتے تھے۔ حتیٰ کہ انہوں نے امام صاحب سے مل کر سلطنت عثمانی سے اپنے ہاں کے جہاد کے لئے مدد حاصل کرنے کی بھی کوشش کی"۔

☆ "جمال الدین صاحب کی تائید کی وجہ سے امام صاحب کی عزت اور قوت بہت بڑھ گئی اور امام صاحب نے اس کو پورا پورا استعمال کیا۔ البتہ امام صاحب کے پاس عزت اور قوت کا ایک اور سرچشمہ بھی تھا۔ وہ یہ کہ وہ خود بھی صوفی شیخ تھے اور اپنے مرشد کے بعد انہی کا درجہ تھا"۔

☆ "امام صاحب مقامی حکمرانوں کو پسند نہیں کرتے تھے اور بعض اوقات ان کے متعلق اپنے تلخ جذبات کا اظہار بھی کر دیتے تھے۔ لیکن ان کا یہ رویہ اس لئے تھا کہ یہ حکمران شریعت پر عمل کرنے اور روسیوں کے خلاف جہاد میں شامل ہونے سے انکار کرتے تھے لیکن جو حکمران یا ان کے خاندان کے لوگ امام صاحب کے ساتھ شریک ہو جاتے تھے انہیں پوری پوری عزت دی جاتی تھی اور انہیں اہم عہدے دیئے جاتے تھے۔ تاہم امام صاحب حکمرانوں کے بارے میں ذاتی ناپسندیدگی کے باوجود تقریباً تمام حکمرانوں سے معمول کے تعلقات قائم رکھتے تھے"۔

☆ "امام صاحب نے Serfdom یعنی نیم غلامی کی حیثیت ختم کر دی۔ یہ حیثیت چار دیہات کی آبادی کی تھی جو آوارستان کے سابقہ خوانین کے تھے۔ اسی طرح روسی قیدیوں کی بھی (جو مسلمان ہو جاتے تھے) نیم غلاموں کی حیثیت ختم کر دی جاتی۔ امام صاحب روسی علاقے کے مسلمان مالکوں کے بھاگے ہوئے نیم غلاموں کو پناہ دیتے تھے اور انہیں ان کے مسلمان مالکوں کو واپس کرنے سے انکار کر دیتے تھے۔ البتہ نیم غلاموں کی آزادی عمومی نہیں تھی۔ مذکورہ بالا چار دیہات کے لوگوں پر ٹیکس کا بوجھ وہی سابقہ ہی رہا۔ فرق یہ واقع ہوا کہ جو رقم یہ لوگ آوارستان کے خان کو دیتے تھے وہ اب بیت المال کو ادا کرنے لگے"۔

☆ "امام صاحب عوام سے اہم معاملات میں مسلسل رابطہ رکھتے تھے۔ امام صاحب

خطوط اور اعلانات بھیجتے تھے جو سب لوگوں کے سامنے پڑھے جاتے تھے۔ وہ ان میں فتوحات کا اور آنے والی مشکلات کا ذکر کرتے تھے' ان کی حوصلہ افزائی کرتے تھے اور انہیں ثابت قدمی کی تلقین کرتے تھے۔ خاص مواقع پر امام صاحب لوگوں کے نمائندوں سے ملتے تھے اور ان سے مسائل پر گفتگو کرتے تھے۔ اپنی حکمرانی کے آخری سالوں میں بھی' جبکہ امام صاحب کا عوام اور ان کے مسائل سے رابطہ کم ہو گیا تھا' وہ اس قسم کے اجلاس بلاتے رہتے تھے"۔

☆ "ایک روسی ذریعہ کا کہنا ہے کہ امام شامل" بڑے باتدبیر شخص تھے اور سیاست کو خوب سمجھتے تھے۔ چنانچہ امام صاحب کا کوئی ماتحت اگر عوام میں مقبولیت حاصل کر لیتا تھا تو' جیسا کہ اکثر حکمرانوں کا طریقہ ہے' امام صاحب اپنے اس ماتحت پر شک و شبہ نہیں کرتے تھے' بلکہ اپنے اس ماتحت کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی کوشش کرتے تھے اور اس طرح عوامی احساسات کی قدر کرتے تھے"۔

☆ "امام صاحب کے سسٹم میں مساوات بہت تھی اور یہ اسلام ہی کے مزاج کے مطابق تھی۔ اصولی طور پر کسی غریب ترین شخص کے لئے اونچی سے اونچی پوزیشن تک پہنچنے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی بشرطیکہ اس میں قابلیت' اخلاص' محنت اور امنگ موجود ہو۔ عملی طور پر تو صرف ایک نائب کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ بہت غریب خاندان سے تھا' لیکن امام شامل کے نقطۂ نظر سے اس اصول کی بڑی عملی اہمیت تھی"۔

☆ "پہاڑی لوگوں کی بہت بڑی اکثریت نے خصوصاً چیچن لوگوں نے امام صاحب کا آخری وقت تک ساتھ دیا اور ایسا کرنے میں بہت زیادہ تکالیف برداشت کیں۔ انہیں اپنے گھربار اور کھیت چھوڑنے پڑے اور سنگلاخ پہاڑوں میں جانا پڑا۔ جب بالکل ہی مجبور ہو گئے تب وہ روسیوں کے ساتھ ملے۔

☆ لوگوں کی یہ ثابت قدمی اور یہ کارنامے اس وجہ سے نہیں تھے کہ امام صاحب بہت طاقتور تھے اور آبادی پر ان کا بڑا مضبوط کنٹرول تھا اور نہ یہ وجہ کافی تھی کہ لوگوں

کو روسیوں سے نفرت تھی۔ اصل وجہ امام صاحب کی رہنما کی حیثیت میں ایک مقناطیسی شخصیت تھی اور ان کے پاس بہت سارے ذرائع تھے جن کو کام میں لاکر وہ پہاڑی لوگوں میں وفاداری اور اطاعت کا جذبہ پیدا کرسکتے تھے۔ ان ذرائع میں ایک اہم حیثیت ان کے بے لاگ اور فوری انصاف کی تھی"۔

☆ "امام صاحب ایک مضبوط اور سخت گیر حکمران تھے لیکن وہ بے لاگ انصاف کرنے والے تھے۔ ہر شخص کی شکایت پر کارروائی ہوتی تھی' چاہے بڑے سے بڑے افسروں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو"۔

حیرتناک حقیقت نگاری

میں لیسلے بلانچ صاحبہ اور جناب موشے گامر کی قطعی غیر جانبداری اور حقیقت کے واشگاف اظہار کا اعتراف کرتا ہوں۔ میرا ذاتی احساس یہ ہے کہ ان لوگوں نے مسلمانوں کے امام صاحب کے خلاف مذہبی تعصب کا قطعاً مظاہرہ نہیں کیا اور ایک طالب علم اور طالب حقیقت کے روپ میں نہایت منصفانہ اور قابل قدر تحقیق کرکے لکھا۔ جس شخص نے تیس سال تک غیر مسلموں سے جنگ کی اور دشمن کے پانچ لاکھ آدمی موت کے گھاٹ اتارے' ان مصنفین نے کمال صاف گوئی سے اس کے متعلق لکھا ہے کہ :

"وہ ایک بے داغ کردار کا انسان تھا۔ وہ ایک نیک اور پرہیزگار مسلمان تھا جس کا اسلامی شریعت پر ایمان تھا اور وہ اس پر عمل کرتا تھا۔ وہ ایک مقناطیسی شخصیت کا مالک تھا۔ وہ اپنے علاقے کے لوگوں کے دلوں پر حکمران ہونے کے باوجود اپنے مرشد کے سامنے بچھا رہتا تھا"۔

اُمت مسلمہ کے لئے سبق

امت مسلمہ اپنے اس نامور ہیرو کے ایسے تابناک کردار پر بجا طور پر فخر کرسکتی ہے۔ میں دنیا کی تاریخ سے تو واقف نہیں ہوں' لیکن میرا وجدان ہے کہ اس قسم کے صاف ستھرے' پاکیزہ اور پاکباز عظیم انسان جو سیاست اور اقتدار کی پرخار وادیوں میں اپنے

دامن کردار کو میلا نہ ہونے دیں صرف امت مسلمہ میں ہی ہو سکتے ہیں' جہاں قرآن مجید کی صداقت کے ثبوت میں جناب نبی کریم ﷺ کا کردار ہی پیش کیا گیا تھا اور یہی کردار امت کے لئے واجب التقلید قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ ہمارے بڑے بڑے ہیرو اپنے سامنے وہی مثال رکھتے ہیں' ہمارے پاس ان حضرات کا کردار بھی اسلام کی حقانیت کا ایک بہت بڑا ثبوت ہے۔

میں نے یہاں تک ہی لکھا تھا کہ میرے محترم عزیز فرخ زمان صاحب نے ۷۱-۱۹۷۰ء کا ایک واقعہ سنایا کہ وہ اُس زمانے میں امریکن یونیورسٹی بیروت میں پڑھ رہے تھے۔ اس وقت انہوں نے وہاں کے تاریخ کے استاد لبنانی عیسائی پروفیسر "کے صلیبی" کو کلاس روم میں غازی صلاح الدین کی بے حد تعریف کرتے سنا۔ پروفیسر صاحب نے کہا کہ غازی صلاح الدین ایوبی میرے (یعنی پروفیسر صاحب کے) ہیرو ہیں اور وہ اپنے زمانے کے بھی بہت بڑے ہیرو تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ سلطان ایوبی عام بشری کمزوریوں سے مبرا' انتہائی بلند کردار انسان تھے۔ وہ ایک عظیم فاتح اور ایک مطلق العنان حکمران تھے لیکن بطور فاتح یا حاکم بھی ان کا حلم و تدبر' منصف مزاجی اور مذہبی رواداری انہیں اس عہد کی نامور تاریخی شخصیات میں ممتاز ترین پوزیشن دیتی ہے۔

لیجئے میری تحریر کی سیاہی ابھی خشک نہیں ہوئی تھی کہ ایک مزید بلند کردار مسلم ہیرو سامنے آ گئے اور میرا وجدان صحیح ثابت ہوا کہ ایسے پاکباز بڑے لوگ صرف مسلمانوں میں ہی ہو سکتے ہیں۔ البتہ ہمیں اپنے ہیروز کی تاریخ پر بہت کام کرنے کی ضرورت ہے۔ انصاف اور سچائی پسند غیر مسلموں کا لکھا ہمارے لئے کافی نہیں ہو سکتا۔ اس امت سے باہر کے بڑے بڑے ذی اقتدار لوگوں میں سے اکثر شراب' عورت' جھوٹ' مکر و فریب' لالچ اور ریاء جیسی تمام خرابیوں میں ملوث ہیں۔ جن میں یہ تمام خرابیاں نہ پائی جاتی ہوں ان میں بھی چند خرابیوں کے وجود کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ بحیثیت انسان ان کا قد بہت چھوٹا ہوتا ہے۔

پاکستان کے جو لوگ اسلامی شریعت کے نفاذ اور اسلامی نظام کے قیام کے خواہش مند ہیں یا اس مقصد کے لئے کوشاں ہیں ان کو اپنے سامنے ذاتی کردار کا مندرجہ بالا مطلوبہ

معیار رکھنا چاہئے اور اسے حاصل کرنے کے لئے کوشاں رہنا چاہئے۔ پاکستان کے روز افزوں مصائب کا حل شریعت اسلامی کے نفاذ اور عوام' خاص طور پر بااثر لوگوں اور صاحبان اقتدار کے باکردار ہونے میں ہے۔ یہ دونوں چیزیں لازم و ملزوم ہیں۔ خداوند تعالیٰ ہم سب کو ان دونوں کی توفیق عطا کرے' آمین ثم آمین!

بقیہ : علامہ اقبال اور مسلمانانِ عجم

اب فوج علماء اور امریکہ کی مدد سے شاہ ملک میں واپس آگیا۔ تہران کے ہوائی اڈہ پر شاہ کا استقبال کرنے والوں میں حضرت آیت اللہ بروجردی بھی موجود تھے۔ ۱۸/ اگست ۱۹۵۳ء کو تہران میں غنڈوں کے غول داخل ہو گئے اور جنرل زاہدی نے ٹینکوں اور توپوں کی مدد سے تہران پر قبضہ کرلیا اور مصدق گرفتار ہوگیا۔ اس تمام عمل پر امریکہ کی سی آئی اے کا کل خرچ تین لاکھ نوے ہزار ڈالر اٹھا۔

اس موقع پر بھی علماء کا کردار مشکوک نظر آتا ہے کیونکہ پہلوی بادشاہت کو اقتدار کی بازیابی میں ان کی ہمدردیاں ایک بار پھر شاہ کے ساتھ تھیں۔ (جاری ہے)

ضرورت رشتہ

جٹ برادری سے تعلق رکھنے والے ۳۱ سالہ بی ایس سی الیکٹریکل انجینئر' ماہانہ آمدنی 15000 روپے' شاہدرہ کے رہائشی کے لئے دینی گھرانے سے موزوں رشتہ درکار ہے۔ ذات پات کی کوئی قید نہیں۔

رابطہ : نعیم اختر عدنان' 36۔کے ماڈل ٹاؤن لاہور فون : 3-5869501

رفیق تنظیم کی ہمشیرہ کے لئے جس کی عمر ۲۸ سال اور خلع یافتہ ہے' موزوں رشتہ درکار ہے۔ تعلیم ایف اے اور فاضلہ قاریہ' مدرسۃ البنات جامعہ صدیقیہ گجرات سے فارغ التحصیل ہے۔

رابطہ کے لئے : ابو عمران' دفتر تنظیم اسلامی حلقہ پنجاب شمالی

۴۴۔بی حسنین مارکیٹ' سیٹلائٹ ٹاؤن بالمقابل جنرل ہسپتال' مری روڈ راولپنڈی

حالاتِ حاضرہ

امیر تنظیم اسلامی کے خطاباتِ جمعہ کے پریس ریلیز

○

سی ٹی بی ٹی میں شمولیت ایٹمی صلاحیت سے دستبرداری کے مترادف ہے

۱۱ ستمبر= حالات و واقعات کی ترتیب سے اس شبہے کو تقویت ملتی ہے کہ شہباز شریف کے دورۂ امریکہ کے دوران سی ٹی بی ٹی پر دستخط کے حوالے سے سب کچھ طے پا چکا تھا اور اب قومی اسمبلی اور سینٹ میں بحث کے ذریعے محض "لیپا پوتی" کی جا رہی ہے۔ یہ بات امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے مسجد دار السلام باغ جناح لاہور میں نماز جمعہ سے قبل اپنے خطاب میں کہی۔ انہوں نے کہا کہ اللہ کا حکم ہے کہ دشمن کے مقابلے کیلئے زیادہ سے زیادہ جنگی قوت اور سامان حرب فراہم کرو۔ سی ٹی بی ٹی میں شمولیت اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی صریح خلاف ورزی ہی نہیں بلکہ خداداد ایٹمی صلاحیت کی ناشکری کے مترادف ہے۔ اس لئے کہ ایٹمی صلاحیت اندرون ملک سائنسی اور ایٹمی ٹیکنالوجی کی ترقی کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک خاص وسیلے سے اللہ نے یہ صلاحیت پاکستان کو عطا فرمادی تھی اور سی ٹی بی ٹی پر دستخط کرنے کا حکومتی فیصلہ درحقیقت کامیاب ایٹمی تجربات کرنے کے "جرم" پر سجدۂ سہو کے مترادف ہوگا۔ امیر تنظیم اسلامی نے کہا کہ حکومتی حلقوں کی جانب سے پھیلایا جانے والا یہ تاثر نہایت مغالطہ آمیز ہی نہیں انتہائی مضحکہ خیز بھی ہے کہ سی ٹی بی ٹی میں شمولیت کے بعد ہم جب چاہیں اس معاہدے سے نکل سکتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اگر اس میں شمولیت کیلئے عالمی طاقتوں کا اس قدر دباؤ ہم پر ہے تو اس سے نکلنا کیونکر ممکن ہوگا؟ انہوں نے کہا کہ دنیا کے واحد اسلامی ملک کی ایٹمی صلاحیت کا قلع قمع کرنا یہود و نصاریٰ کے ساتھ ساتھ ہنود کی بھی دلی تمنا اور راولین خواہش ہے۔ انہوں نے کہا سی ٹی بی ٹی پر دستخط کرنا ملی و قومی اعتبار سے حکومت کی بہت بڑی غلطی قرار پائے گا۔ اس لئے کہ یہ ایک ایسے جال میں بتدریج پھنسنے کے مترادف ہے کہ جس کا نتیجہ بالآخر ایٹمی صلاحیت سے دست کش ہونے کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ سی ٹی بی ٹی پر دستخط کے حوالے سے حکومت نے اپنے سابقہ موقف میں مسلسل پسپائی اختیار کی ہے اور نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ ہم محض تین لاکھ ڈالر کی امداد کے عوض ملک و ملت کا سودا کرنے کیلئے تیار ہو گئے ہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے اس امر پر گہرے تاسف کا اظہار کیا کہ وہ حکومت جو فارن کرنسی اکاؤنٹس میں جمع شدہ گیارہ ملین ڈالر کی رقوم بغیر ڈکار لئے ہڑپ کر گئی وہ اب آئی ایم ایف کی محض تین ملین ڈالر کی قسط کے عوض پاکستان کے ایٹمی پروگرام کا سودا کر کے "قومے فروختند چہ ارزاں

فروختند" کی پالیسی پر عمل پیرا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے لندن سے شائع ہونے والے ایک جریدے کے حوالے سے یہ تلخ سوال بھی حکومت کے سامنے رکھا کہ ایٹمی صلاحیت کو معمول سی رقم کے عوض فروخت کرنے کے بعد ہمارے پاس اور کونسی چیز فروخت کرنے کیلئے باقی رہ جائے گی! انہوں نے کہا کہ کشکول توڑنے اور خود انحصاری کے بلند بانگ دعووں کے باوجود مسلسل سودی قرضوں پر انحصار کی پالیسی اپنانے سے ملک کی آزادی و خود مختاری عالمی مالیاتی اداروں کے پاس گروی رکھی جا چکی ہے۔ انہوں نے کہا کہ تین ملین ڈالر کی یہ متوقع قسط ہمارے لئے قرض کے اس بوجھ میں مزید اضافے کے باعث بنے گی جو ملکی معیشت کیلئے پہلے ہی ناقابل برداشت حد تک بڑھ چکا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ حکومت کے نزدیک ڈیفالٹر قرار پانا ہی شاید وہ "کبیرہ گناہ" ہے کہ جس سے ہر قیمت پر بچنا ضروری ہے خواہ اس کیلئے ملکی سالمیت کو داؤ پر لگا دیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ سودی نظام کو ختم کئے بغیر قرضوں میں جکڑے ہوئے پاکستان کو عالمی مالیاتی استعمار کے چنگل سے نکالا نہیں جا سکتا۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ میرے ساتھ ملاقات کے موقع پر وزیر اعظم میاں محمد نواز شریف اور وزیر اعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف نے ایک سال میں سود کے خاتمہ کا یقین دلایا تھا' مگر ڈیڑھ سال کا عرصہ گزرنے کے باوجود سودی نظام کے خاتمے کے آثار نظر نہیں آتے۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ وزیر اعظم کے حکم پر راجہ ظفر الحق کی سربراہی میں قائم کردہ انسدادِ سود کمیشن کی سفارشات کو بھی عملی جامہ پہنانے سے گریز کیا جا رہا ہے۔ انہوں نے سی ٹی بی ٹی پر بے نظیر کے موقف پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ امریکہ سے اظہارِ وفاداری اور نیاز مندی کے حصول میں بے نظیر اور نواز شریف ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ مجھے یقین ہے کہ پاکستان اسلام کے عالمی غلبہ کے ضمن میں لازماً اہم کردار ادا کرے گا مگر اسلام کے نام پر قائم ہونے والے ملک میں ہم بحیثیت قوم تاحال اسلامی احکامات پر عمل کرنے کیلئے تیار نہیں۔

ہمارے معاشی بحران کا واحد حل بیرونی قرضوں کی واپسی سے انکار ہے

۱۸ ستمبر= سی ٹی بی ٹی پر دستخط کیلئے ہم پر امریکہ کی جانب سے ڈالا جانے والا شدید دباؤ دراصل نیو ورلڈ آرڈر کا حصہ ہے اور ہم اس کے آگے اس لئے بے بس ہیں کہ قیام پاکستان سے لے کر اب تک ہماری ہر حکومت کی خارجہ پالیسی کا مرکز و محور یہی نکتہ رہا کہ ہر قیمت پر امریکہ کی حمایت حاصل کی جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ معاشی میدان میں غلط حکمت عملی اختیار کرنے اور بیرونی قرضوں کو اللوں تللوں میں اڑانے کا نتیجہ ہے کہ آج ہماری جان شکنجے میں آئی ہوئی ہے۔ ہم سودی قرضوں پر ملنے والی بیرونی امداد کے جال میں اس بری طرح پھنس چکے ہیں کہ ہر سال سود کی قسط ادا کرنے اور ڈیفالٹر ہونے سے بچنے کیلئے مزید

قرض کی بھیک مانگنا ہماری مجبوری بن چکا ہے۔ لیکن اس بھیک کی بدولت جو امداد ملتی ہے اس سے نہ صرف یہ کہ بیرونی قرضوں کا بوجھ مزید بڑھ جاتا ہے بلکہ اگلے سال سود کی ادائیگی بھی پہلے کے مقابلے میں زیادہ کرنا پڑتی ہے۔ یہ بات امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے جمعہ سے قبل اپنے خطاب میں کہی۔ انہوں نے مزید کہا کہ ہمہ وقت کشکول ہاتھ میں لے کر ترقی یافتہ ممالک یا ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف سے قرض کے حصول کیلئے خوشامد کرنے اور بھیک مانگتے پھرنے سے کہیں بہتر ہیں کہ ہم اس حقیقت کو تسلیم کر لیں کہ ہم بالفعل دیوالیہ ہو چکے ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ ہماری معاشی بدحالی کے حوالے سے ہی ہمیں سی ٹی بی ٹی پر دستخط کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے اور امریکہ کے دباؤ کے سامنے گھٹنے ٹیکنے کا اصل سبب ہمارا یہی معاشی بحران ہے۔ اس کا حل صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ ہم جرأت سے کام لے کر بیرونی قرضے واپس کرنے سے انکار کر دیں اور صاف کہہ دیں کہ ہمارے پاس دینے کو کچھ نہیں ہے اور ساتھ ہی سی ٹی بی ٹی پر دستخط کے معاملے میں بھی صاف جواب دے دیں کہ یہ معاہدہ چونکہ ہمارے ملکی و قومی مفادات کے خلاف ہے لہٰذا ہم تمہارے دباؤ میں آکر دستخط نہیں کریں گے۔ اس کے بعد ہم جرأت و ہمت کے ساتھ اللہ کی نصرت کے بھروسے پر معاشی پابندیوں کا مقابلہ کرنا اور ملکی وسائل پر انحصار کرنا ہو گا تاکہ ملکی معیشت کو ٹھوس بنیادوں پر استوار کیا جا سکے۔ بصورت دیگر ہماری سسکتی ہوئی ملکی معیشت کمزور سے کمزور تر ہوتی چلی جائے گی اور ہم عالمی مالیاتی اداروں کے زر خرید غلام اور نیو ورلڈ آرڈر کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر رہ جائیں گے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ سودی قرضوں کی ادائیگی سے انکار کے نتیجے میں دو چار برس سختی کے ضرور آئیں گے لیکن اس کے بعد پھر ہم معاشی طور پر خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے اور کشکول کو فی الواقع توڑ پھینکنے کے قابل ہو سکیں گے۔ ورنہ مسلسل قرض کی بھیک مانگتے رہنا اور عالمی طاقتوں کے ہاتھوں بلیک میل ہوتے رہنا ہمارا مقدر بنے گا۔

ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مشیت ایزدی میں پاکستان کیلئے اسلام کے عالمی غلبے کے حوالے سے مستقبل میں ایک خاص کردار معین ہے لیکن ہم کم مسلسل کوشی اور کم ہمتی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ تاہم قدرت ہمیں خواہی نخواہی ادھر ہی کھینچ کر لے جا رہی ہے' جس کی ایک روشن مثال ماضی میں قرارداد مقاصد کی منظوری کی صورت میں سامنے آئی تھی اور تازہ مثال مجوزہ پندرھویں آئینی ترمیم ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ اب ہم پر منحصر ہے کہ غلبہ دین اور قیام خلافت کے عظیم مقاصد کیلئے جان و مال کھپا کر اپنی آخرت کماتے ہیں یا صرف دنیا کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔

ایران افغان سرحد پر ایرانی فوجوں کی نقل و حرکت پر گہری تشویش کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر اسرار احمد نے اس تنازعہ کو عالمی طاقتوں کی مسلمانوں کے خلاف ایک سازش قرار دیا اور ایران کی

حکومت سے اپیل کی کہ وہ افغان سرحد سے اپنی فوجیں واپس بلا کر خیر سگالی کا مظاہرہ کرے اور اس سازش کو ناکام بنانے میں مدد دے اور اسلامی ممالک کے توسط سے طالبان حکومت کے ساتھ کشیدگی کم کرنے کی کوشش کرے۔ انہوں نے طالبان حکومت سے بھی درخواست کی کہ ایرانی سفارتکاروں کی گمشدگی اور قتل کے حوالے سے ابتدا میں طالبان نے جو غیر ذمہ دارانہ رویہ اختیار کیا تھا وہ اپنی اس غلطی پر غیر مشروط معافی مانگ کر اپنی اخلاقی عظمت کا ثبوت دیں اور ایران کی شکایات دور کرنے کی کوشش کریں تاکہ مسلمان دشمن طاقتوں کو فائدہ اٹھانے کا موقعہ نہ ملے۔ امیر تنظیم نے اس امر پر زور دیا کہ اس معاملے میں دیگر مسلم ممالک بھی اپنی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے ایران' افغانستان مصالحت کیلئے اپنا کردار موثر انداز میں ادا کریں۔

بقیہ : عرض احوال

کے ریفرنڈم میں تھی کہ اگر آپ کو اسلام چاہئے تو میں از خود پانچ سال کیلئے صدر قرار پا جاؤں گا۔ چنانچہ یہاں بھی یہی صورت ہے کہ اگر آپ کتاب و سنت کو پاکستان کا سپریم لاء بنانا چاہتے ہیں تو اس کی تنفیذ کیلئے میرا من مانا طریق کار بھی قبول کرنا ہو گا۔

— اس کا یہ منفی پہلو بہت افسوس ناک ہو گا کہ اگر لوگ اس پیکج کو اس کے دوسرے جزو کی بنا پر رد کر دیں تو اس سے یہ تاثر پیدا کیا جا سکے گا کہ لوگوں کو قرآن اور سنت کی بالادستی قبول نہیں ہے! اور اس تاثر کا وبال اس شخص پر ہو گا جس نے اس پیکج میں دوسرا جزو شامل کیا ہے!

— تنظیم اسلامی اور تحریک خلافت پاکستان کی مخلصانہ درخواست میاں محمد نواز شریف سے یہ ہے کہ اس پیکج کو SPLIT کر کے اولاً صرف مذکورہ بالا تین اقدامات پر مشتمل بل پاس کروالیں —— اگر ان کے نزدیک پاکستان کے موجودہ وفاقی اور پارلیمانی نظام میں کوئی پہلو اصلاح طلب ہیں تو انہیں ایک جداگانہ بل کی حیثیت سے سامنے لائیں! —— اس کے بعد بھی اگر کسی طبقے کی جانب سے مجوزہ شریعت بل کی مخالفت ہوتی ہے تو اس طبقے کی اسلام دشمنی بالکل عیاں ہو جائے گی۔ پھر پاکستان اور اسلام کے بہی خواہوں کیلئے ضروری ہو گا کہ وہ ان اسلام دشمن عناصر کا قلع قمع کرنے کیلئے میدان میں نکل آئیں۔

KHALID TRADERS

IMPORTERS – INDENTORS – STOCKISTS &
SUPPLIERS OF WIDE VARIETY OF BEARINGS,
FROM SUPER – SMALL TO SUPER – LARGE

AUTHORIZED AGENTS
NTN
BEARINGS

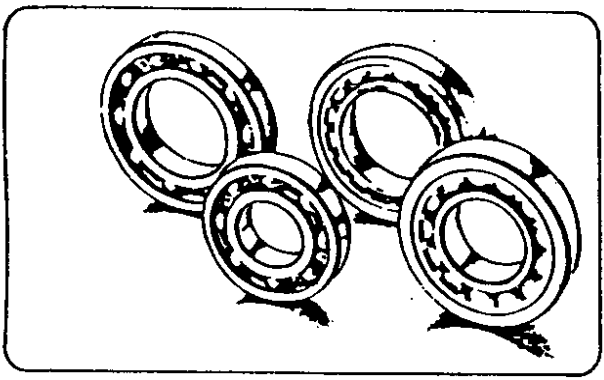

PLEASE CONTACT

TEL : 7732952-7735883-7730593
G.P.O. BOX NO. 1178, OPP KMC WORKSHOP
NISHTER ROAD, KARACHI-74200 (PAKISTAN)
TELEX : 24824 TARIQ PK CABLE : DIMAND BALL FAX : 7734776

FOR AUTOMOTIVE BEARINGS : Sind Bearing Agency 64 A-65,
Manzoor Square Noman St. Plaza Quarters Karachi-74400 (Pakistan)
Tel : 7723358-7721172

LAHORE : (Opening Shortly) — Amin Arcade 42, Brandreth Road, Lahore-54000 Ph : 54169

GUJRANWALA : — 1-Haider Shopping Centre, Circular Road, Gujranwala Tel : 41790-210607

WE MOVE FAST TO KEEP YOU MOVING

MONTHLY
Meesaq
LAHORE

Reg. No. CPL 125
Vol. 47 No. 10
Oct. 1998

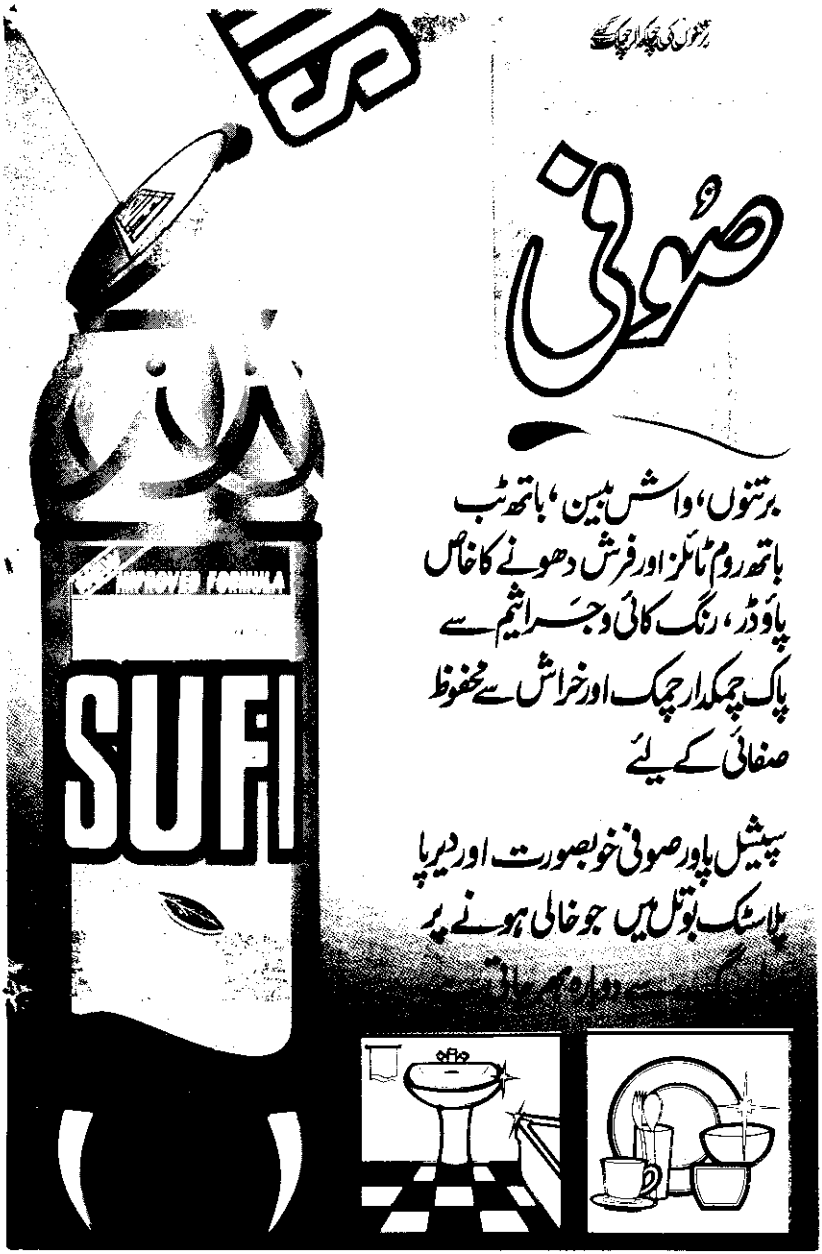

FOTO SCAN PH:7234042-7111906